عجب مُسافر دشت تھے

نبیلہ ابر راجہ

عجب مسافر دشت تھے

مغرب کی طرف سے بڑے زور کی آندھی آئی تھی۔ پل بھر میں گھر کا وسیع صحن اور برآمدہ جامن اور سرو کے درختوں کے پتوں اور گرد سے اٹ گیا۔ آندھی کے ساتھ بادل بھی گرج رہے تھے۔ رملہ نے بھی گم بھاگ تار پہ ٹنگے کپڑے اتارے۔ ادھر انوشہ کچن میں مصروف تھی سنک برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ دھو دھو کر بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ صبح سے انوشہ کی طبیعت بھی خراب تھی مسلسل مصروف رہنے کی وجہ سے اس کی کمر اور پنڈلیاں درد کر رہی تھیں۔ ننھی علیزہ اماں کے لیے سخت بے چین تھی۔ دو تین بار وہ کچن میں اس کے پاس آئی۔ وہ مضبوطی سے اس کی ٹانگیں پکڑ کر کھڑی ہو جاتی تو مجبوراً اسے زبردستی باہر چھوڑ کر آنا پڑتا۔ وہ اسے چارپائی پہ بٹھا آتی وہاں سے علیزہ [illegible] ڈرتی اور رونے لگتی تو پاس کھیلتے بچوں میں سے کوئی نہ کوئی اس کی آہ وزاری سے متاثر ہو کر چارپائی سے نیچے اتار دیتا۔ وہ گرتی پڑتی پھر انوشہ کے پاس آ جاتی جو بیک وقت کئی کاموں سے نبرد آزما تھی۔ ابھی ابھی عفان چائے کا آرڈر دے کر گیا تھا کہ ابو کے دوست آئے ہیں تو فوراً دو کپ چائے بنا کر بھجوا دیں۔ صبح سے وہ بلا مبالغہ اب تو تین بار چائے بنا چکی تھی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔ بھائی جان بہت ملنسار اور مہمان نواز تھے ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ جب کوئی دن مہمانوں کی خاطر تواضع کے بغیر گزر جائے۔ گھرداری کی زیادہ بلکہ تمام تر ذمہ داری اب انوشہ کے سر آ پڑی تھی اور تو کوئی کچن میں پھٹکتا ہی نہ تھا۔ انوشہ کی وجہ سے بھابھی کو [illegible] آ گئی تھی۔ محنتی تو وہ پہلے بھی نہ تھیں انوشہ کو دیکھ کر اور بھی پھیل گئی تھیں، ورنہ بچے ہونے سے پہلے وہ جو کام کرتی تھیں۔ وہ سلسلہ بھی انوشہ کی آمد کے بعد ختم ہو گیا تھا۔

"ارے کتنی دیر سے سجان رو رہا ہے کہ پھوپھو فرنچ فرائز بنا دیں مگر پھوپھو جیسا کہ
مزاج ہی نہیں ملتے، بوا بھی جانے کہاں مرتی ہیں۔" مہوش بوا کو صلواتیں سنانے کے ساتھ ساتھ
آلوؤں کی ٹوکری اٹھا کر لائیں، انوشہ ہمیشہ کی طرح ان سے دب گئی۔

"بس بھابھی! یہ پتیلا مانجھ کر بنانے ہی لگی تھی۔ آپ بیٹھیں کمرے میں چلیں۔ میں
ابھی لاتی ہوں۔ بس آپ جائیں۔" اس کا عاجزی کو چھوتا لہجہ بھابھی کے ماتھے کے بلوں میں اور
بھی اضافہ کر گیا۔

"رہنے دو، اپنے احسانات کے بوجھ کو ہوشیار جتاتی ہو کہ میں یہ کرتی ہوں۔ میں وہ
کرتی ہوں جیسے ہم نے تمہیں اس گھر میں نوکرانی بنا کر رکھا ہوا ہے ہاں!"

انوشہ کسی بھی قسم کی بدمزگی سے بچنے کے لیے خاموش ہو گئی اور کسی طرح مہوش بھابھی
کی منت سماجت کر کے زبردستی ان کے ہاتھ سے آلو لے لیے۔

انوشہ نے چکن کیوب کا پیکٹ کھولا اور ایک کیوب نکال کر گرم پانی میں حل کیا
پھر اس پیسٹ کو اچھی طرح آلوؤں میں مکس کیا چند منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نے آلو تیل
سے بھری کڑاہی میں فرائی ہونے ڈال دیے۔ صد شکر کہ اس نے املی اور پودینے کی چٹنی پہلے ہی
بنائی تھی۔ اس نے چٹنی کے ساتھ کیچپ بھی ڈال دیا۔ رملہ خاموشی سے ایک طرف کھڑی اس کی
مصروفیت کو دیکھ رہی تھی۔ فرنچ فرائز تیار ہو چکے تھے۔ انوشہ نے ٹماٹر کاٹ کر پلیٹ سجائی اور
درمیان میں خوش رنگ آلو رکھے۔ اور بھابھی کے کمرے میں چلی آئی۔

"یہ لو سجان چندا تمہارے فرنچ فرائز بنا کر لے آئی ہوں۔ اس میں چکن کا ذائقہ ہے"
جاؤ اپنے فرنچ فرائز میں نہیں کھاتا۔" وہ انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ مہوش لاتعلقی سے اسکرین پہ
ناچتی ہیروئنوں میں مگن تھیں۔

"پلیز سجان کھا لو۔" وہی عاجزانہ انداز جو سامنے والے کو خوامخواہ آسمان پہ چڑھا
دیتا۔ سجان نے ہاتھ مار کر پلیٹ پرے کی۔ بھابھی نے مسکراتے طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ساری دنیا کے کام ہو جاتے ہیں اگر میرے بچے کچھ کہہ دیں تو یہ خوامخواہ کی
مصروفیت دکھائیں گی۔ سجان عادتوں کا پکا بھی ہے، کتنے لاڈ پیار میں پلا ہے، پورے سات سال
انتظار کرنے کے بعد یہ مجھے ملا ہے۔"

انوشہ میں اب مزید یہاں کھڑے رہنے کی ہمت نہیں تھی۔ خود کو گھسیٹتی باہر آ گئی۔

مہوش نے اس کے باہر نکلتے ہی جانے کس کونے سے میکڈونلڈ سے لایا گیا لنچ باکس برآمد کیا اور بڑے لاڈ سے سجان کے آگے رکھا۔ انوشہ کی لائی ہوئی پلیٹ انہوں نے اپنے آگے کرلی۔ سجان برگر چپس اور فرنچ فرائز دیکھ کر خوش ہوگیا۔

"شوہر کی لگام ان کے ہاتھ میں تھی اور دیور تو تھا ہی ان کا بے دام غلام آخر اپنی حسین وجمیل بہن سے سو سو جتن کر کے اس کی شادی جو کرائی تھی۔ مہوش کے والدین راضی ہی نہیں تھے۔ وہ تو ایک بیٹی دے کر افسردہ تھے سوچا کہ دوسری بھی اس جہنم میں جھونک دیتے۔ یہ ساری کوششیں اور ریاضت مہوش کی ہی تھی انہوں نے والدین کی ناراضی مول لے کر اس رشتے کی حمایت کی اور بالآخر حیدر کی تو ڈپارٹ لگا کر ہی چھوڑی۔ اس دوران مہوش کی اپنے گھر والوں سے ناراضی چلتی رہی خدا خدا کر کے صلح ہوئی۔ حیدر ان کا شکریہ ادا کرتا نہ تھکتا جنہوں نے دیور کی خاطر ماں باپ کو ناراض کر دیا تھا، وہ اب ہمہ وقت مہوش کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا رہتا۔ بڑے بھائی کی طرح وہ بھی انوشہ اور رملہ سے لاپرواہ ہو چکا تھا۔ روشی کے حسن کے سحر سے بچ نکلنا آسان نہ تھا۔ یہ بھی اس کا احسان تھا کہ اس نے کئی امیر کبیر گھرانوں کے رشتے ٹھکرا کر حیدر سے شادی کی تھی۔ دن میں کئی بار وہ اس حقیقت کو حیدر کے سامنے متاثر کن انداز میں پیش کرتی اور حیدر ہوا بھرے غبارے کی طرح پھولتا جاتا کہ یہ اعزاز اس کے حصے میں آیا ہے۔ وہ پوری طرح روشی اور مہوش کے قبضے میں تھا۔

❁

مہوش چند دن کے لیے میکے گئی ہوئی تھیں مہوش زیادہ تر بچوں کو گھر چھوڑ کر ہی جاتی تھیں پیچھے انوشہ اور رملہ انہیں سنبھالتیں۔ ماں کے جانے کے بعد تو وہ اور بھی آزاد ہو جاتے۔ سجان تو ہاتھ میں نہیں آتا تھا۔ کسی کو خاطر میں نہ لانا اس کا وتیرہ بن چکا تھا یہی حال سملی اور بنگی کا تھا۔

روشی اور حیدر کے دو بچے تھے۔ وہ ویسے بھی کم بچے خوشحال گھرانہ کے اصول پر عمل پیرا تھے۔

"انوشہ بہت حساس ہوگئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات کا موازنہ گزشتہ گزرے واقعات سے کرتی جب بی جان زندہ تھے، اماں کا ممتا بھرا وجود انہیں زمانے کے گرم و سرد سے بچائے ہوئے تھا۔"

"ان کی وفات کے بعد مہوش اور روشی پوری طرح مختار کل بن چکی تھیں۔ گھر سے پرانے اصول و قوانین رخصت ہوئے۔ مہوش نے مسعود سے کہہ کر وی سی آر لے لیا تھا۔ سجان نے ضد کر کے کمپیوٹر بھی لے لیا۔ جوان ہوتے بچے اپنی مرضی کی ہر چیز سے مکمل لطف اندوز ہو رہے

تھے اب کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔

"ابی جان ان تمام چیزوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ انہیں لغو اور شیطانی آلات قرار دیتے تھے۔ ان کے گھر میں صرف پی ٹی وی کے خاص خاص پروگرام ہی دیکھے جاتے تھے، رات عشاء کی نماز کے بعد وہ اسلامی کتب سے ایمان افروز واقعات پڑھ کر گھر والوں کو سناتے، دس بجے کے بعد سب سو جاتے۔ اب پرانے اصولوں کو دقیانوسی کہہ کر پس پشت ڈال دیا گیا۔ اب مہوش کے اپنے اصول و ضوابط تھے جن سے سر مو انحراف کرنا حیدر اور سعد کے لیے ناممکن تھا۔ رہ گئی انوشہ اور رملہ تو وہ کسی گنتی ہی میں نہ تھیں۔

مہوش دو دن کے بعد آئی تھیں۔ انوشہ پر بڑی مہربان تھیں۔

"آؤ تمہیں کچھ چیزیں دکھاؤں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئیں۔

انہوں نے ایک ایک چیز اسے دکھائی جس میں ان کے کپڑے، بچوں کے ریڈی میڈ ملبوسات، سعد بھائی کے لیے قیمتی شوز، ایک عدد کرسٹل کا واٹر سیٹ، چھوٹی موٹی اشیاء اس کے علاوہ تھیں۔ انوشہ نے دل کھول کر تعریف کی۔

"پتہ ہے یہ سب امی نے دلایا ہے، سعد کا ہاتھ آج کل ذرا تنگ ہے ناں، تینوں بچے نئے کپڑوں کی ضد کر رہے تھے۔ امی نے پیسے دیے کہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خرید لو۔" انہوں نے بتایا تو انوشہ کو نئے سرے سے بھابھی کے والدین پر رشک آیا جب بھی میکے جاتیں واپسی پر بھی خالی ہاتھ نہ آتیں۔

"بھئی۔ کھاتے پیتے خاندان سے تعلق ہے۔ میرے میکے میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بیٹیوں کو دینے سے رزق اور بھی بڑھتا ہے میرے ابا اور امی ابھی تک میری ہر فرمائش پوری کرتے ہیں مجال ہے جو کبھی انکار کریں۔ پتہ ہے جان تم نے پینتالیس ہزار کا کمیٹی ڈال لیا ہے۔ یہ پیسے ابو نے دیے تھے میں نے فرمائش جو کی تھی۔" کافی دیر وہ بھابھی کے پاس بیٹھی ان کے میکے والوں کی سخاوت اور دریا دلی کے قصے سنتی رہی جن میں صد درجہ مبالغہ آمیزی کی گئی تھی۔ علیزہ کے رونے کی آواز آئی تو اس کی جان چھوٹی۔

❁

علیزہ دو سال کی ہونے والی تھی سارے گھر میں دوڑتی پھرتی تھی۔ انوشہ کے سر اس کے پیچھے پیچھے پھرتے رہنے کی اضافی ذمہ داری آ گئی تھی۔ بے انتہا شریر بچی تھی ہر کام کی

زیادتی کے سبب بے انتہا تھکی ہوتی ایسے میں اگر علیزا اس کے نزدیک آتی تو وہ ایک آدھ تھپڑ اسے جڑ ہی دیتی۔ بعد میں بیٹھ کر خوب روتی اور سوئی علیزا کے چہرے پہ پیار کرتی۔ ہر طلوع ہونے والا سورج اس کے لیے بہت سارے کام لے کر آتا۔ وہ گھن چکر بنی رہتی۔ ناشتا بنانے میں رمہ اس کی مدد کرتی بعد میں سارا دن وہ اکیلی ہوتی اور کاموں کے ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ اچھے وقتوں میں یہ گھر تعمیر ہوا تھا اچھا خاصا کشادہ اور وسیع تھا۔ ڈبل اسٹوری اس کی صفائی خوالی تھی اس کے علاوہ ایک انیکسی کے ساتھ گیسٹ روم حال ہی میں بنایا تھا یوں صفائی کرنے ہی میں اچھا خاصا وقت صرف ہو جاتا۔ سب سے زیادہ پھیلاوا ٹی وی لاؤنج، بچوں کے کمروں اور کچن میں ہوتا۔ سمیٹتے سمیٹتے وہ ہلکان ہو جاتی۔ اس دوران علیزا بھی جاگ جاتی۔ جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی تب سے اس نے انوشہ کی مصروفیات سے سمجھوتہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کم ہی اسے تنگ کرتی۔ انوشہ، سکی اور رمل کے مسترد شدہ کھلونے اس کے آگے رکھ دیتی تو وہ مگن ہو جاتی۔ انوشہ اطمینان سے اپنا کام کرتی۔

◉

سجان اور سکی چچی کے ساتھ روشی کے بچوں کی بھی اسکول سے چھٹیاں تھیں۔ اب وہ سب گھر میں دھما چوکڑی مچاتے۔ کسی کو منع کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ علیزا بھی ان کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کرتی مگر سجان بڑی بے رحمی سے پیش آتا۔ انوشہ سے اور تو کچھ نہ ہوتا۔ ہر طرف سے خود کو بے یار و مددگار پا کر رونے بیٹھ جاتی۔ وہ کمزور سے دل کی مالک تھی بدمزگی بڑھ جانے کے خیال سے اس نے کبھی سعد بھائی سے بھی شکایت نہیں کی تھی۔ رہی مہوش بھابھی تو وہ بچہ ہے کہہ کر بات ٹال جاتیں۔

گھر میں خرابی مہوش کے بہو بن کر آنے کے بعد پیدا ہوئی۔ انہوں نے ڈھکے چھپے انداز میں سعد کی برین واشنگ شروع کر دی۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہ روشی اور حیدر کو قریب لائیں۔ حیدر پہلی نگاہ ہی میں روشی کے تیر نظر سے گھائل ہو گیا۔ اس سے شادی نہ ہونے کی صورت میں اس نے خودکشی کی دھمکی دے دی۔ ادھر روشی کے گھر والے بھی نہیں مان رہے تھے، آخر کار روشی بہو بن کر آ ہی گئی۔ رہی سہی کسر اس نے پوری کر دی۔ ابا جان اور اماں کی آنکھیں بند ہوتے ہی وہ مالک، مختار بن گئیں۔ انوشہ کے لیے رشتہ بھی مہوش نے تلاش کیا اور جانے کون کون سی نادیدہ خوبیاں بیان کیں کہ حیدر اور سعد لڑکے کے پرجوش حامی بن گئے۔ بعد

کے مراحل خود بہ خود طے ہوتے گئے۔ انوشہ کو معمولی سا جہیز اور چند جوڑے کپڑے دے کر رخصت کردیا گیا کیونکہ لڑکے کا کہنا تھا کہ اسے جہیز نہیں چاہیے۔ مہوش نے بھی لڑکے کی ہاں میں ہاں ملائی، یوں سعد اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے اور چاہتے ہوئے بھی بہن کے لیے کچھ نہ لے پائے حالانکہ ابی جان دونوں بیٹیوں کے لیے اچھا خاصہ جمع جتھا چھوڑ گئے تھے۔ انوشہ اپنی قسمت پہ صابر و شاکر تھی۔

شادی کے بعد دولہا کے اوصاف وجوہر کھل کر سامنے آئے۔ موصوف غلط کاموں میں ملوث تھے۔ انوشہ کو باپ نے حلال کی روٹی کھلائی تھی۔ اس کے ضمیر کو یہ سب گوارا نہ تھا۔ وہ نوید سے کچھ کہتی تو وہ روئی کی طرح اسے دھن کر رکھ دیتا۔ سال کے اندر اندر علیزا بھی اس دنیا میں آگئی۔ نوید جن لوگوں کے لیے کام کرتا تھا۔ ان میں سے ایک شخص کیساتھ اس کی ٹھن گئی۔ سو نوید کو خاموشی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کی لاش پہ انوشہ کے سوا رونے والا کوئی نہیں تھا نہ جانے نوید کون تھا، کہاں سے آیا تھا اس کے والدین یا دیگر رشتہ دار تھے بھی یا نہیں۔ یہ کسی کو بھی پتہ نہیں تھا ہاں البتہ ایک بار نوید نے انوشہ کے پوچھنے پہ اسے بتایا تھا کہ وہ کوئٹہ کے ایک قبائلی سردار کا بیٹا ہے۔ نسل در نسل دشمنی میں اس کے خاندان کے زیادہ تر مرد مارے جا چکے تھے۔ وہ اپنی جان بچا کر نکل آیا تھا۔ انوشہ کے گھر والوں میں سے کسی نے بھی نوید کے بارے میں زیادہ چھان بین نہیں کی تھی۔ مہوش کی تو بن آئی تھی کیونکہ نوید نے جہیز لینے سے انکار کردیا تھا۔

صحیح معنوں میں انوشہ کو اب بے سائباں ہونے کا احساس ہوا تھا۔

مہوش اور روشی اپنے فرائض سے جان کر پہلو تہی کرنے لگیں۔ تمام دن کی محنت کے بعد انوشہ کو یوں لگتا جیسے وہ سب کچھ بے سبب کر رہی ہے کیونکہ کبھی کوئی جھوٹے منہ اس سے ہمدردی نہیں کرتا تھا گویا وہ جو کچھ کر رہی تھی۔ یہ اس کا فرض تھا۔

❁

علیزا زور و شور سے رو رہی تھی۔ رعدا سے لے کر گھر سے قریب پارک میں چلی آئی جہاں اس وقت اور بھی بہت سے بچے کھیل کود میں مگن تھے۔ علیزا اس کی گود سے اتر گئی۔ رعدا لوگوں کے جائزے میں مصروف ہو گئی یونہی اس کی نگاہ سامنے پڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ علیزا جس جھولے کے پاس کھڑی تھی، اب وہاں نہیں تھی، پریشانی کے عالم میں وہ بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چاروں کونوں میں نگاہ دوڑائی۔ وہ کہیں نہیں تھی اس سے پہلے کہ وہ گھبرا کر

زور زور سے رونا شروع کر دیتی۔ علیزا کو ایک شخص اٹھائے ادھر ہی آتا دکھائی دیا۔ وہ دور ہی سے روشنی کی طرف اشارے کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے بھاگ کر اس آدمی سے علیزا کو لیا اور آنکھوں میں آئے آنسو بمشکل پیچھے دھکیلے۔

"علیزا! کہاں چلی گئی تھیں تم...؟"

"میں آپ کو بتاتا ہوں۔" اس نووارد شخص نے شائستگی سے اس کی بات کاٹی۔

"میں پارک کے سامنے اس طرف اسٹیشنری میں بیٹھا ہوا تھا کہ یہ بچی بھی اس طرف نکل آئی۔ میں نے سوچا، شاید اس کے والدین یہیں قریب ہی ہوں گے۔ اس لیے ادھر آگیا۔ اس کیوٹ سی بے بی نے آپ کو دور سے ہی دیکھ کر اشارے کرنے شروع کر دیے تو میں سمجھ گیا آپ اس کے ساتھ ہیں۔" وہ شکل و صورت سے مہذب سا شخص بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں بتا رہا تھا۔ روشنی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ علیزا اس سے چپکی جا رہی تھی اور توتلی زبان میں جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ اس مہربان صورت آدمی نے جیب سے چاکلیٹ نکال کر علیزا کو دیں اور جھک کر اسے پیار کیا۔

"کیوٹ بے بی! کل پھر آنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔" اس نے جاتے جاتے علیزا کو یاد دہانی کرائی۔

❁

سعد اور حیدر کے سالے کی شادی کو چند دن ہی ہوئے تھے کہ انہوں نے نئے جوڑے کی دعوت کا پروگرام بنا ڈالا۔ حسب معمول نوشابہ پہ سارے کام کا بوجھ تھا۔ کھانے پکانے میں وہ ویسے بھی ماہر تھی۔ دعوت کا سارا مینیو اس نے خود ترتیب دیا تھا اور سب کی پسند کے آئٹم شامل کیے تھے۔ عفان علیزا کو باہر لے گیا تا کہ وہ کام کرتی نوشابہ کو تنگ نہ کرے۔ روشنی نے خود عفان سے کہا تھا کہ وہ علیزا کو اٹھا نے لے جائے۔ عفان اسے اٹھائے اپنی دھن میں مگن آسمان پہ اڑتی رنگ برنگی پتنگوں میں کھویا ہوا تھا جب تیمور حسن کی گاڑی سے ٹکرایا۔ علیزہ دھکا لگنے سے اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ خود عفان کا سر گاڑی کے بونٹ پہ لگا۔

ڈاکٹر آفتاب کا کلینک سامنے ہی تو تھا۔ تیمور نے دونوں کی بینڈیج کرائی۔ علیزا کو وہ پہچان چکا تھا کہ یہ وہی بچی ہے جو پارک میں اسے ملی تھی۔ اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ عفان تو اس سے دوستی بھی کر چکا تھا۔

"بیٹے! آپ کا گھر کہاں ہے۔ مجھے گائیڈ کرو تاکہ میں آپ کو وہاں چھوڑ آؤں"

عفان فوراً راضی ہو گیا یہ پاس ہی تو تھا گھر۔ وہ خوش پوش اور شائستہ نوجوان جب علیزا کو اٹھائے اور عفان کی انگلی پکڑے گھر میں داخل ہوا تو روشی کی نگاہ سب سے پہلے اس پہ پڑی۔ ساتھ عفان تھا جس کے ماتھے پہ بینڈیج تھی۔ اسے دیکھتے ہی روشی نے شور کرنا شروع کر دیا۔ اس کے واویلا پہ تیمور حسن گھبرا گیا ایسی صورت حال کا اس نے تصور تک نہ کیا تھا۔ حیدر، سعد اور دوسرے بھی اس شور شرابے پر باہر نکل آئے۔ انوشہ نے علیزا کی ٹانگ پہ بینڈیج دیکھی تو دل پہ ہاتھ رکھ کر وہیں ڈھے ہی گئی۔ حیدر نے شور کرتی روشی کو بمشکل چپ کرایا۔ تیمور بے چارا خجل سا کھڑا تھا حیدر اسے اندر لے گیا۔ اس کی قیمتی گاڑی لباس اور رکھ رکھاؤ سے مہوش سمیت دوسرے بھی متاثر دکھائی دے رہے تھے۔

حیدر نے تیمور کو رات کا کھانا کھا کر ہی جانے دیا۔ سعد کو بھی تیمور بہت اچھا لگا تھا، پہلی ملاقات ہی میں اس نے سادگی سے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ مہوش اس کے کاروبار کی تفصیل سن کر بڑی متاثر ہوئی۔

تیمور اکثر ان کے گھر آنے لگا۔ وہ بھی اس کے گھر جاتے تھے اب تو وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے۔ تیمور کا اپنا بزنس تھا۔ والدین حیات نہیں تھے۔ بس ایک بڑا بھائی تھا جو جرمنی میں مقیم تھا۔ بہن کوئی تھی نہیں۔ وہ یہاں اپنا بزنس کر رہا تھا جو ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ابھی تک تیمور غیر شادی شدہ تھا۔ یہ اس کا ایک اور پلس پوائنٹ تھا۔ وہ آتا تو اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جاتی۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک اسے کمپنی دیتے۔ علیزا تیمور کے ساتھ بہت مانوس ہو گئی تھی اگر ایک دو دن وہ نہ آتا تو وہ اپنے توتلے لہجے میں کہتی "تیمور انکل نہیں آئے" رملہ اور انوشہ کم ہی تیمور کے سامنے جاتیں۔ ابی جان اور اماں کی دی گئی تربیت کا اثر تھا جو وہ ابھی تک نہیں بھولی تھیں۔

تیمور نے اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے کی خوشی میں پارٹی دی تو ان سب کو بھی بڑے اصرار سے مدعو کیا اور علیزا کو تو خاص طور پر لانے کو کہا تھا۔ جوش و خروش سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ روشی اور مہوش نے پارلر سے فیشل، مساج تھریڈنگ اور جانے کیا کیا کروایا۔ جس پہ اچھے خاصے پیسے خرچ ہو گئے تھے مگر شکل بھی نکھر آئی تھی۔ اب کپڑوں کا مسئلہ تھا۔ وہ مہنگے بوتیک سے خریدے گئے۔ رملہ تو بہت الجھی تھی۔

سعد بھائی نے انوشہ اور رملہ کو بھی جانے کو کہا تو انہیں بھی رضامندی دینی پڑی۔

انوشہ تو عرصہ دراز سے اس طرح کی محفلوں سے کنارہ کش ہو گئی تھی۔ بھائی کے کہنے کی وجہ سے وہ جانے پہ تیار ہوئی۔ مہوش بڑی جز بز ہوئیں کیونکہ ان دونوں کے پاس ڈھنگ کے کپڑے ہی نہیں تھے۔ انوشہ تو اپنے حال میں مگن رہتی تھی۔ اسے اچھے کپڑوں کا شوق رہا ہی نہیں تھا۔ رہ گئی رملہ تو اس کے پاس کپڑے تو تھے مگر مہوش کے نقطہ نگاہ سے وہ کسی اعلیٰ تقریب میں پہننے کے لائق نہیں تھے۔ چنانچہ از سر نو بازار جا کر مہوش ان دونوں کے لیے کپڑے لائیں تاکہ تیمور حسن کے سامنے سبکی نہ ہو۔ آخر کو تھیں تو ان کی نندیں۔ وہ چاہے بھی تو اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھیں۔

❁

تیمور حسن کا گھر بڑا خوب صورت اور ویل ڈیکوریٹڈ تھا، خاصے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا بنانے والے ہاتھوں نے تمام تر مہارت اسے خوب صورت دکھانے پہ صرف کر دی ہے۔ سب لوگ متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں مرعوبیت و ستائش تھی۔ ایک ایک چیز پہ تبصرے ہو رہے تھے۔ تیمور نے چند گنے چنے مہمانوں کو مدعو کیا تھا۔ مہوش اور روشی نے اپنی الگ ٹولی بنالی تھی جبکہ رملہ کو اپنی ہم عمر زری مل گئی تھی۔ انوشہ بے توجہی سے جتنے مسکراتے بے فکر خوش باش لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ بیرے وقفے وقفے سے کھانے پینے کی مختلف اشیاء سرو کر رہے تھے۔ ڈنر کا انتظام اندر ہال میں کیا گیا تھا۔ انوشہ نے ایک پلیٹ میں کباب اور تھوڑا سا قورمہ نکالا۔

اس سے یہ بھی نہیں کھایا جا رہا تھا عجب اجنبیت محسوس ہو رہی تھی جبکہ باقی مہمان خاصی بے تکلفی سے کھا پی رہے تھے۔ تیمور تمام مہمانوں کا جائزہ لیتا ہوا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کچھ اور بھی لیں ناں، آپ کی پلیٹ تو تقریباً خالی ہے، لگتا ہے کھانا پینے سے بھی آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ آپ بہت سادہ ہیں، آپ اچھی ہیں تو اچھا لگنا چاہیے۔" وہ انوشہ کے سادہ و پرکار روپ کا جائزہ لیتے ہوئے آہستگی سے بولا پھر اس کے چہرے پر پھیلتی ناگواری دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔ انوشہ اس کی گفتگو سے پہلے تو بوکھلائی پھر اسے غصہ آ گیا۔ اسے مزید کھانا کھایا ہی نہیں گیا۔ کیا لگتا تھا وہ اس کا جو اتنے مزے سے مشورے دے کر چلتا بنا تھا۔ ناگواری کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ابا جان کی موجودگی میں اس نے کبھی ایسی کسی تقریب میں شرکت نہیں کی تھی نہ کسی مرد کو برملا یوں کھلم کھلا اس پہ تبصرہ کرنے کی جرات ہوئی تھی۔ ابا جان کہتے تھے، عورت کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ مرد کو بری نگاہ ڈالنے کی اور بے تکلفی برتنے کی ہمت

ہی نہ ہو تو کیا اس کے رویے یا کردار میں کوئی جھول یا ہلکا پن آ گیا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اپنے گھر میں اس نے کبھی تیمور سے دانستہ بے تکلفانہ گفتگو کی ہو یا سلام کرنے سے زیادہ اس کی زبان سے کوئی اور لفظ تیمور کے روبرو اس کی زبان سے نکلا ہو۔

اسے ابھی تک یاد تھا جب مدت کے بعد اس نے ہلکے پیلے رنگ کو سفید اور کالی کڑھائی والا سوٹ پہنا تو بھابی نے کیا کیا کہا تھا۔

”انوشہ تم بیوہ ہو۔ اس طرح کے چونچلے اب تم پہ جچتے نہیں ہیں اگر یہ الٹے ڈھنگ رکھے تو تمہارے بھائیوں کے نام پہ دھبہ لگے گا۔ سادگی سے رہو، نگاہیں نیچی رکھو۔“

بھابی کے جملوں نے اسے اندر تک چھید ڈالا تھا۔ اس نے اب تک بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ جانے انہوں نے اس کے کون سے رنگ ڈھنگ دیکھے تھے جو بھائیوں کی عزت پہ دو حرف لانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس نے کبھی شوخ کلر کے کپڑوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اپنے تمام شوق اس نے زندہ اپنے دل میں دفن کر لیے۔ بھابی ہنسی ہنسی میں بڑی دلخراش جملے کہہ جاتی تھیں۔

تیمور حسن کے بارے میں انوشہ کی رائے خراب ہو گئی تھی۔ عورتوں سے گفتگو کے بہانے ڈھونڈنے والے مرد اسے کبھی اچھے نہیں لگتے تھے تیمور حسن اسے اسی قبیلے کا نظر آ رہا تھا۔ پر علیزا اسے بہت پسند کرتی تھی تو تلے لہجے میں جب وہ اسے تیمول انکل کہتی تو وہ بے اختیار اسے خود سے لپٹا کر چوم لیتا۔ شکل تو تھی ہی پیاری، اس پہ باتیں اتنی دل موہ لینے والی کرتی کہ مخاطب کے دل میں اس ننھی سی گڑیا کے لیے صرف پیار کا جذبہ ہی اٹھتا۔

”انوشہ اس کی آمد پہ علیزا کو دانستہ ادھر ادھر کر دیتی مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ جانے اسے کیسے تیمور کی آمد کی خبر ہو جاتی۔ وہ جب بھی آتا علیزا کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتا۔ اس روز بھی وہ اس کے لیے چاکلیٹس، لالی پاپ اور سپر کریپ کے کئی پیکٹس لایا تھا جب علیزا کو دیے تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”مما کہتی ہیں آپ دندے ہیں۔“ (مما کہتی ہیں آپ گندے ہیں) ڈرائنگ روم میں موجود تمام افراد چونک گئے سعد اور حیدر کو بہت غصہ آیا۔ سعد تیمور کے ساتھ پارٹنر شپ کا خواب دیکھ رہے تھے اور یہ انوشہ سب کچھ خراب کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔

انہوں نے انوشہ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی تھی اس بات پہ کہ اس نے تیمور میں کون

سی برائی دیکھی ہے جو بچی کو منع کیا ہے۔

دوپہر گزر چکی تھی۔ روشی مہوش کے میں کمرے میں تھی دونوں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔

''اب رملہ بھی شادی کے لائق ہو گئی ہے۔'' مہوش یوں بولیں جیسے انہیں رملہ کی شادی کی بڑی فکر ہے۔ روشی نے ان کی تائید کے ساتھ ایک نیا رخ بھی دکھانے کی کوشش کی۔

''ہاں آپا! آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر اب ایسا رشتہ دیکھنا چاہیے جو تمام عمر رملہ کو گھر بٹھا کر رکھے۔ ایسا نہ ہوا انوشہ کی طرح پھر ہمارے سینے پہ مونگ دلنے آ جائے۔''

''اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اپنے فیاض بھائی ہیں ناں۔ انہیں آج کل ایک شریک حیات کی ضرورت ہے بس عمر میں بارہ چودہ سال بڑا ہے تو کیا ہوا۔ پیسے والا ہے۔ رملہ راج کرے گی راج، رہ گئی انوشہ تو وہ ادھر ٹھیک ہے، اب کون اسے پوچھے گا۔ ایک بچی کا بھی ساتھ ہے آج کل تو کنواری لڑکیوں کو اچھے رشتے نہیں ملتے ہیں، وہ تو پھر ایک شوہر کو مٹی کے سپرد کر چکی ہے ورنہ کسی سے کہہ سن کر بات چلانے کی کوشش کرتی۔'' مہوش نے اپنے چہرے پہ مصنوعی سنجیدگی وافسردگی طاری کر لی۔ جیسے اس دنیا میں ان سے بڑھ کر انوشہ کا کوئی ہمدرد ہی نہ ہو۔

''ویسے آپا انوشہ کی وجہ سے ہمیں گھر کی طرف سے بہت بے فکری ہے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ تو ہم نے بھی اسے پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ اچھا کھاتی، اچھا پہنتی ہے، سب سے بڑھ کر اپنی مرضی سے جو چاہے کرتی ہے۔ دوسری شادی کی صورت میں اسے یہ سکھ نہیں ملیں گی۔'' روشی کی یہ بات اگر رملہ سن لیتی تو ضرور لڑائی ہو جاتی۔ مبالغہ آمیزی کی انتہا تھی اور رملہ سے ایسی باتیں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔

❁

سجان کے اسکول سے شکایت آئی تھی کہ وہ اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں اور دوسرے بچوں کے ساتھ مار پیٹ کرتا ہے۔ سعد مری گئے تھے۔ جہاں سجان کے پرنسپل نے انہیں بلوایا تھا۔ واپسی پہ سعد بہت پریشان تھے کیونکہ پرنسپل نے صاف صاف وارننگ دی تھی اگر سجان نے آئندہ ایسی حرکت کی تو اسے اسکول سے نکال دیا جائے گا کیونکہ یہاں متمول خاندانوں کے بچے پڑھتے تھے۔

پرنسپل نے سعد سے کہا تھا کہ سجان بے حد تشدد پسند ہے، انہوں نے بڑے خلوص سے

انہیں ایک مشہور سائیکاٹرسٹ کا پتہ بھی دیا تھا اور سجان پہ کڑی نگاہ رکھنے کو کہا تھا۔

انوشہ کھانے کے برتن دھو کر کچن سمیٹ رہی تھی۔ علیزا ابھی ابھی سوئی تھی۔ اس نے اس وقت کو غنیمت جانا تھا کیونکہ رات کے لیے کبابوں کا مسالا بھی تیار کرنا تھا اور چنا چاٹ بنانے کے لیے چنے ابالنے تھے۔ کباب بنا کر اس نے ٹرے میں پھیلا کر انہیں فریج میں رکھ دیا۔ لگے ہاتھوں آٹا بھی گوندھ لیا۔ عین اسی وقت ڈور بیل بجی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے آرام کا وقت تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں محو استراحت تھے، جانے اس وقت کون آ گیا تھا۔

اس نے گیٹ کھولا۔ تیمور حسن اپنے پروقار سراپے اور مسکراتی نگاہوں سمیت سراپا انتظار تھا۔ انوشہ نے اس پہ نگاہ ڈالنے سے گریز کرتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اس نے اے سی آن کیا اور باہر نکلنے لگی تو تیمور حسن اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

"مجھے بھابھی کے سامنے بات نہیں کرنی ہے ورنہ اس وقت آپ کو پریشان نہ کرتا۔ پلیز بیٹھ جائیں، میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔" وہ شائستگی سے بولا پر وہ کھڑی رہی۔ بے اعتباری کی تحریر اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اسے ہر لحظہ کسی کے آنے کا دھڑکا سا لگا تھا۔

"انوشہ! میں گھماؤ پھیراؤ کا قائل نہیں ہوں نہ کسی کو دھوکا دینا میری سرشت میں ہے۔ صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے بارے میں میرے محسوسات اب ایک واضح صورت اختیار کر گئے ہیں۔ میں انہیں ایک پائیدار تعلق میں بدلنا چاہتا ہوں۔ آپ اور علیزا کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا بھی مجھے بہت افسوس ہے۔ یہ بھی میرے علم میں ہے کہ آپ کو اس گھر میں پالتو جانور سے بھی کم حیثیت دی جاتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی تمام تکلیفوں کو راحتوں سے بدل دوں۔ انوشہ! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اس کے تمام انکشافات آنکھیں پھاڑے منہ کھولے حیرت سے سن رہی تھی۔

"میں پھر آؤں گا۔ تب تک آپ اچھی طرح سے سوچ لیں۔ اور ہاں، اب بے شک بھابھی کو بلا لائیں اگر سعد گھر میں ہے تو اسے بھی بتا دیں کہ تیمور حسن ڈرائنگ روم میں انتظار کر رہا ہے۔" وہ الٹے قدموں باہر نکلی اور مہوش بھابھی کو اٹھایا۔ اتنے میں سعد بھائی بھی آ گئے۔ وہ مشروب کے ساتھ دیگر لوازمات ڈرائنگ روم میں بھجوا کر کمرے میں آ گئی جہاں رمشہ علیزا کے ساتھ بے خبری کی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ وہ بھی ایک کرسی پہ جا کر بیٹھ گئی۔ یوں لگ رہا

تھا۔ تمام اعصاب بے کار ہو گئے ہیں ہاتھ پاؤں میں ابھی تک لرزش تھی۔ نوید کی موت کے بعد کسی نے پہلی مرتبہ یوں بے دھڑک اپنی چاہت کا اظہار کیا تھا اور ایک بیٹی کی ماں ہونے کے باوجود بہت پروپوزل ملا تھا۔

❁

گیارہ بج گئے تھے۔ نیند انوشہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رملہ نے غیر محسوس سے انداز میں اس کا چہرہ جانچا اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

''آپی! کوئی بات آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہے ناں، دن کو بھی آپ نے مجھے نہیں بتایا۔ وہ پریشانی ابھی تک آپ کے چہرے پہ موجود ہے۔'' وہ اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے رسان سے بولی تو انوشہ کچھ دیر ذہن میں الفاظ کو ترتیب دیتی رہی پھر بولی تو اٹک اٹک کر۔

''رملہ۔ وہ تیمور حسن ہے ناں۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی جیسے سوچ رہی ہو۔ اب آگے کیا کہے پھر وہ آہستہ آہستہ جھکی نگاہوں کے ساتھ رک رک کر اسے بتاتی چلی گئی۔

''آپی یہ تو بہت اچھی بات ہے اس وقت آپ کے حق میں یہی بہتر ہے حالات جس نہج پہ جا رہے ہیں اور جو گھر والوں کا رویہ ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ اقدام انتہائی مناسب ہے۔ بھائیوں کی بے حسی آپ نے ملاحظہ کر لی ہے ان سے توقع رکھنا عبث ہے۔ نوید بھائی اتنے مثالی شوہر نہیں تھے کہ آپ ان کی یاد میں جوگ لے لیں۔ پھر تیمور صاحب اچھے انسان دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بھلا آپ سے کیا فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر ان کے ذہن میں کوئی ٹیڑھ ہوتی تو وہ آپ کو پرپوز نہ کرتے۔ ان کا رویہ ایک شریف انسان کا ہے۔ خوشیاں بار بار دروازے پہ دستک نہیں دیتیں۔ وقت ضائع مت کریں۔'' وہ کسی عمر رسیدہ و تجربہ کار بزرگ کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔

''رملہ علیزا کا کیا بنے گا۔ باپ کے سائے سے تو پہلے ہی محروم ہے۔ کیا میں جیتے جی اسے ماں سے بھی محروم کر دوں۔''

''وہ کیوں آپ سے محروم ہونے لگی۔ تیمور بھائی ایسے لگتے تو نہیں ہیں کہ آپ ماں بیٹی کو الگ کر دیں۔ علیزا سے وہ اتنا پیار کرتے ہیں، وہ بھی ان سے اتنی مانوس ہو گئی ہے۔ یقیناً انہوں نے سوچ سمجھ کر یہ بات کی ہوگی۔ میرا خیال ہے علیزا جیسی پیاری بچی کو تو وہ بخوشی اپنے پاس رکھیں گے آپ خوامخواہ اندیشوں کو دل میں جگہ مت دیں۔ اوپر والا بہتری کرے گا

اب اگر تیمور آپ سے جواب مانگتیں تو آپ بھائی سے بات کرنے کو کہیں۔ دنیا والوں کو زبانوں کا مت خیال کریں۔ آپ کے سامنے بہت لمبا سفر ہے، آپ چاہے کتنی ہی پاک صاف کیوں نہ ہوں۔ ہمارے اردگرد رہنے والے آپ کے ہر عمل کو غور سے دیکھتے ہیں۔ آپ انہیں کیوں؟ آپ نے بال کیوں بنائے؟ آپ نے فلاں رنگ کے کپڑے کیوں پہنے؟ آپی آپ جیسی لڑکی کا جینا ایسا ہی ہے جیسے ہر قدم تنی ہوئی رسی پہ چلنا پڑے آپ کے ساتھ ایک مرد کا نام وابستہ ہونا اس وقت بہت ضروری ہے۔ گھر سے باہر کیوں جائیں، کبھی مہوش اور روشی بھابھی کے رویے پہ غور کیا ہے۔ وہ کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں مجھے تو دہراتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ خون کھولتا ہے۔ آپ تیمور حسن کے پرپوزل پہ آنکھ بند کر کے ہاں کر دیں، آپ کو ایک نام، ایک تحفظ مل جائے گا۔"

وہ جذب سے بولتی بڑے خلوص سے اس کے ہاتھ کو تھپک رہی تھی۔ اس کے لمس اور لہجے میں محبت کا ایسا احساس تھا جو رگ و پے میں سرایت کر کے اس سرشار کر گیا۔ وہ بڑے سکون سے سو گئی۔ رملہ نے اس کے ذہن سے ہر خوف و خدشے کو مٹا دیا تھا۔

◉

"ہماری ناک تلے یہ عشق و عاشقی کے کھیل کھیلے جاتے رہے اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔"

مہوش قصداً اونچی آواز میں روشی سے باتیں کر رہی تھیں تاکہ کچن میں مصروف عمل انوشہ بھی سن لے۔ تیمور نے بڑے سلیقے و سبھاؤ سے بات کی تھی اور جلی بھنی مہوش نے اسے عشق کے معنی پہنا دیے تھے۔ انوشہ جیسی محنتی اور دو بونند انہیں اپنے قبضے سے باہر ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"تیمور حسن نے سعد سے انوشہ صاحبہ کے رشتے کی بات کی ہے۔ کتنا بے حیا شخص ہے۔ خود اپنے منہ سے کس بے شرمی سے بات کی اور کہا کہ جلد ہی وہ اپنے بڑوں کو لا رہا ہے۔ لو پہلے خود بات کی، بعد میں بڑوں کا کہا۔ میں جانتی ہوں۔ تیمور حسن کو کس نے اتنی ہمت دلائی ہے کہ وہ براہ راست اپنا رشتہ پیش کر بیٹھا۔ سچ پوچھو تو مجھے تیمور کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا۔ مشکوک سی حرکتیں ہیں۔ پھر ہماری انوشہ اب اکیلی نہیں ہے۔ ایک بچی کا ساتھ ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو روتی پھرے گی، ہماری نند ہے۔ بھاری نہیں ہے کوئی ہمیں۔ میں سعد سے کہہ کر انکار کرا دوں گی۔" وہ حتمی لہجے میں بولیں تو روشی نے بھی ان کی تائید کی۔ اندر کیک بیک کرتی انوشہ کا رنگ تیمور کے ذکر پر زرد پڑ گیا تھا۔ دراصل مہوش اور روشی کو تیمور اپنی چوتھے نمبر والی بہن شمع کے لیے دل و جان سے پسند آ گیا تھا۔ اب تیمور نے انوشہ کے لیے پرپوزل دیا تو انہیں شدید

وجہ کا لگا۔ ان کی امی ویسے بھی شمع کی طرف سے بہت پریشان تھیں اٹھائیس سال کی عمر ہو گئی تھی۔ ابھی تک کوئی رشتہ نہ آیا تھا۔

اس کی زبان درازی اور جھگڑالو فطرت سے سب خائف تھے۔ اپنے آگے وہ کسی کو کچھ گردانتی ہی نہیں تھی۔ خاندان والے تو اسے پوچھنے تک کے بھی روادار نہ تھے اور جو کوئی باہر سے قسمت کا مارا بھولا بھٹکا آ بھی جاتا تو آگاہ ہو کر دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرتا۔ مہوش اور روشی کی مثالیں بھی تو سامنے تھیں پھر شمع کو آئے روز جو تہ نئی کھٹکیں لاحق رہتی تھیں۔ اس سے بھی اس کی ریپوٹیشن پہ اثر پڑا تھا۔ اسے ایسا شوہر چاہیے تھا جو اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ مہوش تیمور کی نرم مزاجی اور مہذب رویے سے اسے شمع کے لیے سو فی صد پسند کر چکی تھیں۔ شمع کو ایسا ہی شخص تو چاہیے تھا جس کی آواز پہ اس کی آواز حاوی رہے۔ مہوش نے سعد کے سامنے انوشہ کا نام لے کر انکار کر دیا اور جذباتی دل پذیر تقریر بھی کر ڈالی۔ سعد نے بہن سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ آخر تیمور میں کیا کمی ہے جو تم نے انکار کر دیا ہے۔ سعد کی عقل تو مہوش نے سلب کی ہوئی تھی۔ تیمور کو اس انکار سے بہت دکھ ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد بھی وہ معمول کے مطابق ان کے گھر آتا رہا کیونکہ اسے یہ بتایا گیا تھا، یہ انکار انوشہ کی طرف سے ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انوشہ کو یہ انکار واپس لینے پہ مجبور کر دے گا۔

•

ادھر مہوش نے شمع کو بھی بلوا لیا۔ وہ پرانے طور طریقے گھر چھوڑ آئی تھی۔ تیمور کی بڑھ بڑھ کر خاطریں کرتی۔ مہوش کی ہدایت کی وجہ سے وہ بہت نرم اور میٹھی زبان کی مالک بنی ہوئی تھی۔ زبان کی تیز دھار کہیں چھپا آئی تھی۔ رمنہ حیران تھی کہ سعد بھائی نے تیمور حسن کو انکار کر دیا ہے۔ کیوں کیا ہے؟ یہ جواب وہ ڈھونڈنے کی سعی کر رہی تھی۔

❁

مری سے سجان کے پرنسپل نے پھر سعد کو کال کیا تھا۔ وہ بہت پریشانی کے عالم میں گئے۔ مہوش کو کسی متوقع جھگڑے کے خیال سے انہوں نے کچھ نہیں بتایا ان سے بعید نہیں تھا ان کے ساتھ چلنے کی وہ بھی ضد کرتیں۔ پرنسپل احمد خورشید جواد بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے مگر اس وقت بہت غصے میں تھے سعد سر جھکائے سن رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار انہیں مہوش پہ بہت غصہ آیا۔ سجان جو کچھ کر رہا تھا۔ اس کی جو ایکٹوٹیز تھیں۔ وہ ضرور ماں ہونے کے ناتے مہوش کے علم میں رہی تھیں اگر اسے شروع سے ہی پتہ چل جاتا تو وہ طوفان کے آنے سے پہلے

ہی لوگ حفاظتی تدابیر اختیار کر لیتے۔

بابر تھے اس بار تو ان کا دل دہلانے میں کوئی سر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے کلاس فورتھ کی ایک لڑکی ریحان کو اسکول میں بے حوض میں دھکا دے دیا۔ اس نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ اس کا سر پکڑ کر اسی وقت تک فرش سے ٹکراتا رہا جب تک کہ حوض کا پانی اس کے سر سے نکلنے والے خون سے سرخ نہ ہو گیا۔ اسی وقت ایک روز طالب علم نے دیکھ لیا اور شور مچا دیا ورنہ بیری ریحان تو یقیناً زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ اس وقت بھی وہ ہاسپٹل میں تھی۔ اس کے ماں باپ اور خاندان کے دیگر افراد بہت غصے میں تھے۔ ریحان خاصی اثر و رسوخ والا شخص تھا۔ سعد نے تیمور کو بیچ میں ڈال کر بمشکل اپنی جان چھڑائی۔

سعد سجان کو لے کر گھر آ گئے کیونکہ اسکول سے اس کا نام خارج کر دیا گیا تھا۔ مہوش نے یوں ظاہر کیا جیسے یہ خاص بات نہ ہو۔

❁

رملہ دھڑکتے دل کے ساتھ ڈور بیل بجا کر اندر سے کسی کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دعا کر رہی تھی۔ تیمور حسن گھر پہ ہی ہو۔ اس نے صدق دل سے دعا مانگی تھی جب ہی تو تیمور مل گیا تھا وہ رملہ کو دیکھ کر خوشگوار حیرت سے دوچار ہوا۔

اشرف کو چائے سمیت دیگر لوازمات لانے کا کہہ کر وہ رملہ کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی بالآخر تیمور نے ہی توڑا۔

"کہیں رملہ آج کیسے ادھر کا راستہ بھول گئیں جبکہ آپ کی بہن نے تو اس طرف آنے کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔" وہ آرام سے شکوہ کر گیا تو رملہ کو بات کرنی آسان ہو گئی۔

"تیمور صاحب! آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ایسی ہی بات ہے ورنہ انوشہ کی طرف سے اتنا صاف انکار سننے کو نہ ملتا۔"

"مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے، آپ کی مہوش بھابھی سے بات چل رہی ہے۔ یقیناً انہوں نے ہی کہا ہو گا کہ انوشہ ایسا نہیں چاہتی۔ بھائی سے بھی یہی کہلوایا گیا ہو گا۔" وہ غضب کی قیافہ شناس تھی۔

"ہاں، ہو سکتی یہی بات ہے بلکہ مہوش بھابھی نے کوئی اور چکر بھی چلایا ہے۔ کئی بار اشارتاً مجھ سے اپنی بہن شمع کے لیے کہہ چکی ہیں۔ میں اب سب کچھ سمجھ چکا ہوں۔ ٹھیک ہے

رملہ! آپ مجھے تیمور صاحب نہیں بلکہ تیمور بھائی کہیں۔ میں اب بہتر طریقے سے اپنا کیس پیش کر سکوں گا۔" وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔

"ویسے آپ انوشہ سے زیادہ ذہین ہیں، بہادر ہیں۔ تھوڑی سی عقل انہیں بھی دے دیں۔ انوشہ کو اس کی شدید ضرورت ہے۔ کمال ہے اپنا ذہن استعمال ہی نہیں کرتیں۔" رملہ مسکرا دی۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ سعد بھائی سے بات کریں اور ہاں میری یہاں آمد کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اب مجھے اجازت دیں۔" وہ بیگ کندھے پہ ڈال کر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ تیمور نے اسے ڈراپ کرنے کی آفر کی جو اس نے سلیقے سے ٹال دی۔

❁

مہوش کی سب سے بڑی بہن ارسلا آئی ہوئی تھیں۔ اپنی چھوٹی بہنوں کے برعکس وہ بہت مختلف اور پسندیدہ عادت کی مالک تھیں۔ انوشہ کو تو وہ بہت اچھی لگتی تھیں۔ مہوش اور روشی کے برعکس وہ نمود و نمائش اور حسد جیسے جذبوں سے دور تھیں۔ مہوش اور روشی دونوں بازار گئی ہوئی تھیں۔ انوشہ ان کی خاطر مدارات میں مصروف تھی۔ ارسلا بھی اس کے پیچھے آ گئیں اور اس کے منع کرنے کے باوجود اس کا ہاتھ بٹانے لگیں۔

"توبہ ہے انوشہ تم کیسے اتنا کام کر لیتی ہو۔" وہ ان کے سادہ سے ریمارک پہ ہنس دی۔ ارسلا نے خود ہی اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

"میں اپنی سب سے بڑی بیٹی کی منگنی کر رہی ہوں، آج کل ہاتھ ذرا تنگ ہے۔ سوچا مہوش اور روشی سے کہوں اللہ نے اتنا کچھ دے رکھا ہے اماں کی مدد بھی کرتی رہتی ہیں۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو مہوش نے عبید کو ڈیڑھ لاکھ روپے دیے ہیں۔ سونیا کو وی سی آر اور چھوٹی کو بائیسکل روشی نے دلائی ہے۔ میرے بھائی عبید کا تو تمہیں پتہ ہی ہے کام وام تو کرتا نہیں ہے۔ ابا بھی ریٹائرڈ ہو گئے ہیں اور پنشن و بچت سرٹیفکیٹ سے کہاں پوری پڑتی ہے۔ اوپر سے اکرام کی شادی بھی کر دی ہے۔ کافی حد تک تو مہوش اور روشی نے بھرم رکھا ہوا ہے۔"

وہ اپنی سادگی میں تمام بھید ایک ایک کر کے کھول رہی تھیں۔ اگر مہوش ہوتیں تو یقیناً انہیں کچا چبا ڈالتیں۔ وہ بالکل بھی تو ان کی بہن جیسی نہیں لگتی تھیں۔ انوشہ کو آج علم ہوا کہ مہوش بھابھی جو واپسی پہ لدی پھندی آتی ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ سعد سارا پیسہ بیوی کے پاس رکھواتے تھے جب ضرورت ہوتی تو لے لیتے ان کا کام اس نوعیت کا تھا کہ وہ روز روز بنک سے پیسہ نکلوانا

افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ان کے کاروبار میں کیش کی اہمیت تھی۔اس لیے مہوش کے پاس ہر وقت ٹھیک ٹھاک رقم موجود رہتی تھی۔انہوں نے کبھی حساب کتاب نہیں کیا اور نہ کبھی اس کی ضرورت محسوس کی وہ مہوش پہ اندھا اعتماد کرتے تھے ان کے اس اعتماد کا مہوش نے خوب صلہ دیا تھا۔

انوشہ کو بہت دکھ ہو رہا تھا۔عنیزہ ذرا ذرا سی چیز اس کی خاطر کتنا ترستی تھی مہوش نے اسے تو کبھی ایک روپیہ بھی نہیں پکڑایا تھا۔اپنے میکے والوں کا گھر وہ کس فراخدلی سے بھر رہی تھیں گویا آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی تھی۔انوشہ نے سعد اور حیدر بھائی سے بذات خود کبھی اپنی زبان سے ضرورت کا سوال نہیں کیا تھا۔وہ اپنی مرضی سے کچھ رقم اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے تو ٹھیک ورنہ وہ عزت نفس کی ماری کہاں انہیں جتانے والی تھی کہ اسے بھی پیسے چاہئیں۔اس شام کو اپنے گھر گئیں جب بازار سے روشنی اور مہوش کی آمد ہوئی۔جاتے وقت ان کے چہرے پہ جو مسکراہٹ وسکون تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ناکام نہیں لوٹی ہیں۔

❁

مہوش پریشانی کے عالم میں سر پکڑے بیٹھی ہوئی تھیں۔انہیں ابھی تک اپنی سماعتوں پہ اعتبار نہیں آیا تھا کہ جو کچھ سنا ہے آیا وہ سچ ہے بھی کہ نہیں۔سعد اپنی بات آرام سے مکمل کر کے اب ان کے تاثرات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔انہیں زندگی میں شاید پہلی بار شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔وہ کیسے بھائی ہیں جنہیں گھر میں ہونے والی ذرا سی بات تک کی بھی خبر نہ تھی۔مہوش کا رویہ ان کی بہنوں کے ساتھ کیسا ہے انہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔اماں جان کے انتقال کے بعد کلی اختیارات کی مالک مہوش ہی تھیں۔خود وہ ان پہ انحصار کرتے تھے ہر ماہ وہ مہوش کو رقم انوشہ اور عنیزہ کی مختلف ضرورتوں کے لیے گھر کے خرچے کے ساتھ پیسے دے کر مطمئن ہو جاتے۔کبھی پلٹ کر پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔آج انہیں یوں لگا جیسے وہ واقعی ایک ذمہ دار بھائی کا رول نبھانے کی پوزیشن میں آ گئے ہوں۔انہوں نے تمام پتے کھول کر مہوش کے سامنے رکھ دیے تھے۔

”میں نے تیمور سے انوشہ کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔“انہوں نے تو جیسے ان کے سر پہ بم پھوڑا جیسے۔کتنی دیر انہیں اپنے حواسوں میں آتے لگ گئی۔بمشکل تمام وہ چہرے پہ دکھاوے کی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوئیں۔

”مگر سعد! کیا انوشہ راضی ہو جائے گی۔آپ اس کی رضا مندی تو معلوم کر لیتے۔“

مصروفیت تھی سعد، رملہ اور انوشہ کو لے کر خود بازار جاتے تو مہوش کے سینے پہ سانپ لوٹ جاتے پر سوائے ہاتھ ملنے کے وہ کیا کر سکتی تھیں۔ سعد نے ایک بار بھی انہیں ساتھ چلنے کی پیشکش نہیں کی۔ وہ اپنی پسند سے انوشہ کو خریداری کروا رہے تھے، شاید اس طرح وہ اپنی گزشتہ کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ جس روز انوشہ کے لیے زیور خرید اگیا اس دن مہوش بھی ان کے ساتھ تھیں۔

رملہ نے انوشہ کا مقدمہ بھائی کے سامنے اس خوبی سے پیش کیا تھا کہ صورت حال اس کے حق میں ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ بہت خوش تھی اس بات کا دکھ بھی تھا کہ انوشہ کے بعد وہ اکیلی رہ جائے گی مگر ایک سکون کا احساس بھی تھا انوشہ اپنے گھر کی ہو رہی ہے۔ اسے پاؤں جمانے کے لیے زمین تو میسر آجائے گی۔ انوشہ کے لیے یہ بات خاصے اطمینان کا باعث تھی۔ تیمور نے بخوشی علیزہ کو اپنے ساتھ رکھنے کا اظہار کیا تھا۔ اس کے لیے اپنے گھر میں بطور خاص کمرا تیار کرایا تھا اس میں وہ ہر چیز تھی جو علیزہ جیسی عمر کے بچوں کے لیے دلچسپی وکشش کا باعث ہو سکتی تھی۔

علیزہ! مہوش کے بیڈ پہ لیٹی ان سے کہانیاں سن رہی تھی۔ وہ کہانیاں سنانے کے بعد وہ خاموش ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے باتوں کا رخ انوشہ کی شادی کی طرف موڑ دیا۔

''علیزہ! جانو! تمہیں پتہ ہے مما شادی کر رہی ہیں۔'' وہ ننھی سی بچی کی آنکھوں میں اپنی بات کا تاثر تلاش کر رہی تھیں۔

''چھادی تیا ہوتی ہے بی بی۔'' (شادی کیا ہوتی ہے؟)

''علیزہ! میری جان! تمہاری مما اس گندے تیمور انکل کے ساتھ چلی جائیں گی تمہیں بھی ساتھ لے جائیں گی۔ تیمور انکل کے پاس اتنا بڑا سا خنجر ہے اس سے وہ آپ کا گلا کاٹ دیں گے ان کے گھر میں بھوت بھی ہیں۔ وہ آپ کو ڈرائیں گے اور ماریں گے۔''

''نہیں نہیں۔ میں مما کے پاچ نہیں داؤں دی۔ تیمول انتل دندے ہیں۔'' وہ مارے خوف کے ان کے ساتھ لپٹ گئی۔

''میری بیٹی میرے پاس رہے گی، پیاری ڈھیر ساری چاکلیٹس اور کھلونے لے کر دوں گی۔ روز آئس کریم کھلانے لے جایا کروں گی۔ پارک بھی جایا کریں گے۔''

مہوش جیتے لفظوں کے زہری جال اسے پہ جارہی تھیں۔

تیمور نے جہیز کے نام پہ کوئی بھی چیز لینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ مہوش کو تیمور کی اس بات پہ بہت خوشی ہوئی کیونکہ سعد بھن کے لیے جو پیسے خرچ کر رہے تھے۔ وہ انہیں بڑی تکلیف دے رہے تھے۔ نوید کی طرح تیمور نے بھی جہیز لینے سے انکار کر کے ان کے شوہر کا خرچا بچا دیا تھا۔ روشی کے بھی اس وقت یہی خیالات تھے۔ شادی سادگی سے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سعد کی طرف سے قریبی رشتہ دار مدعو تھے۔ البتہ تیمور کی طرف سے کافی لوگ آئے۔ اس نے ولیمہ کی تقریب ہوٹل میں کی تھی۔

انوشہ کو گھر ہی میں تیمور کی خالہ زاد نے تیار کیا۔ ساتھ رملہ نے بھی اس کی مدد کی۔ انوشہ کی علیزا کے بارے میں ہدایات جاری تھیں۔

اس کے کپڑے رکھے ہیں کہ نہیں اس کا سوٹ کیس تیار کروا دیا ہے؟ اس کے فلاح جوتے کہاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

رملہ کو ہنسی آ رہی تھی انوشہ جس کے لیے اتنی پریشان ہو رہی ہے۔ وہ تو مہوش بھابھی کے ساتھ چپکی جا رہی ہے۔ کھانے کا سلسلہ جاری تھا۔ رملہ انوشہ کے پاس تھی۔ اسے روشی نے آواز دی تو وہ اندر چلی گئی۔ اب انوشہ اکیلی تھی۔ مہوش کو اب اپنا رول ادا کرنا تھا وہ اس کے پاس چلی آئیں۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بس دعا ہے کہ نصیب اچھے ہوں۔" انہوں نے اوپرے دل سے دعا دی۔

"ایک بات گرہ میں باندھ لو کہ شوہر چاہے جتنا اچھا ہو، بیوی کے پہلے شوہر کی اولاد کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اب تیمور ہی کو دیکھ لو۔ بظاہر تو کہہ رہا ہے علیزا کو ساتھ رکھے گا مگر تم اس خوش فہمی میں مت رہنا۔ فی الحال علیزا کو ادھر ہی رہنے دو۔ اس موقع پہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا اپنا ہی زیاں ہوگا۔ چند دن تیمور کے ساتھ رہ کر اس کے مزاج کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم عین وقت پہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دو علیزا یہاں زیادہ خوش رہے گی۔ تیمور کی یہ پہلی شادی ہے۔ اب اور تمہارے درمیان اسے علیزا کا وجود پسند نہیں آئے گا۔ تم لوگ دعوتوں میں گھومتے پھرنے جاؤ گے تو علیزا کیا کرے گی؟ اب تیمور اتنی فراخدلی کا مظاہرہ ہرگز نہیں کرے گا کہ ہنی مون پہ علیزا کو ساتھ لے جائے۔ تمہیں سمجھداری سے کام لینا ہوگا۔ یہاں رملہ ہے اسے سنبھال لے گی۔ بچوں والی جوان بیوہ کو دوسری شادی دیکھ بھال کر کرنی چاہیے کیونکہ بچے ہیں

لے نہیں رہتے ہیں اور اگر نہ سکو دیکھنا ہو تو بچوں کو بھول جانا چاہیے۔" ہمدردی کے پردے میں مہوش نے اپنے ترکش کے تیر آخر چلا ہی دیے۔

انوشہ بیٹھ کر بیٹھ گئی۔ نئی زندگی کی شروعات ایسی ہوں گی۔ اس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بھابھی کی گفتگو کی روشنی میں اسے اپنی شادی کا فیصلہ اب سراسر احمقانہ لگ رہا تھا۔ آگے قدم قدم پہ کھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ بوقت رخصتی علیزا نے ایک ہنگامہ مچا دیا۔

"میں مما کے تھات نہیں داؤں گی۔ تیموول انکل دندے ہیں۔ انتے پاتل چھلا ہے۔" (میں مما کے ساتھ نہیں جاؤں گی تیمور انکل گندے ہیں ان کے پاس چھرا ہے) وہ زور زور سے رو رہی تھی "تیموول انکل مالیں دے۔ مما بھی دندی ہیں انکل تے تھات دا رہی ہیں" (تیمور انکل مار دیں گے مما بھی گندی ہیں تیمور انکل کے ساتھ جا رہی ہیں) تیمور تو تیمور انوشہ کی اپنی شرمندگی کے سب مہمانوں کے سامنے گویا زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ مہوش نے علیزا پہ بڑی محنت کی تھی۔ وہ رائیگاں نہیں گئی تھی۔ سب کے سامنے وہ جو تاثر دینا دکھانا چاہتی تھیں۔ اس میں سو فیصد کامیاب رہی تھیں۔

⊛

انوشہ جب سے آئی تھی، رو رہی تھی۔

"انوشہ پلیز! آنے کو تیار ہو تو میں اسے ابھی لے آؤں۔ میں خود اتنا حیران ہوا ہوا ہوں کہ وہ یوں اچانک مجھ سے نفرت کیوں کرنے لگی ہے۔" وہ اپنی پیشانی انگلی سے مسل رہا تھا۔ انوشہ کو ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔ اس نے انوشہ کو اپنے بارے میں بڑے ہی شگفتہ انداز میں سب کچھ بتا دیا۔

"ہمارے والدین ہمارے بچپن میں ہی ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔ والدہ صاحبہ نے بڑی محنت اور مشکل حالات میں زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کر کے ہمیں پروان چڑھایا۔ جب میں نے علیزا کو دیکھا تو مجھے اپنا بچپن اور محرومی یاد آ گئی مجھے بہت دکھ ہوا۔ تمہارے ساتھ ہونے والے سلوک نے مجھے اور بھی ہرٹ کیا۔ میرے اندر سے کوئی جذبہ بے اختیار ابھرا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے تمہارا ہاتھ مانگنے کا فیصلہ کیا درحقیقت اس فیصلے کا محرک علیزا کی ذات تھی۔ یہ بتانے میں اب کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تمہیں اب فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور علیزا کے بارے میں تو قطعاً نہیں تم سے زیادہ وہ اب میری

بیٹی ہے۔ میں یہی سمجھوں گا کہ وہ میری پہلی اولاد ہے۔"

انوشہ نے بھیگی بھیگی پلکوں سے اسے تشکر سے دیکھا تو تیمور نے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے تھپ تھپایا۔ اس کے لمس میں یقین اور اعتماد تھا۔ انوشہ کے سارے خود ساختہ خوف اور مہوش کے پیدا کردہ اندیشے اڑن چھو ہو گئے۔ تیمور سا مخلص ساتھی ملے گا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے حقیقی معنوں میں اس کی ازدواجی زندگی اب شروع ہوئی ہو۔

دو دن مری میں تیمور کے بنگلے میں ہنی مون کے نام پہ رہنے کے بعد تیسرے دن وہ تیمور کے ساتھ علیزا کو لینے گئی تو اس نے رو رو کر اپنا حال برا کر لیا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ تیمول انکل سے ساتھ نہیں وانا (تیمور انکل کے ساتھ نہیں جانا) تیمور نے بذات خود اسے کتنے لالچ دیے، پیار سے منایا علیزا کی ناں ہاں میں نہ بدل سکی۔ انوشہ تو بہت پریشان تھی۔ جانے علیزا کو کیا ہو گیا تھا۔ کیا اس نے تیمور کے ساتھ شادی کر کے کچھ غلط کیا تھا۔ فی الوقت اس کے ذہن میں یہی خیال آیا۔ ان دونوں کو مجبوراً مایوس لوٹنا پڑا۔ علیزا مہوش کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

فتح کے احساس سے مہوش کا چہرا چمک رہا تھا۔ انوشہ کو دوسری، تیسری اور چوتھی بار بھی مایوس لوٹنا پڑا تو وہ ٹینشن کا شکار ہو گئی۔ تیمور اسے ناکردہ احساس جرم اور دباؤ سے بچانے کی خاطر مری لے آیا۔ شاید دلفریب نظاروں میں وہ اس تکلیف دہ حقیقت کو فراموش کر دے۔ تیمور خود حیران تھا علیزا جو اس کی آمد کی راہ تکتی تھی۔ اچانک اس سے نفرت کیوں کرنے لگی ہے وہ انوشہ سے بدگمان کیوں ہو گئی ہے۔ کسی دوسرے رخ پہ اس نے سوچا ہی نہیں گیا کیونکہ انوشہ بھی بہت پریشان اور دل شکستہ تھی۔ یہ خوب صورت دلکش مناظر بھی اس کی سوچوں کو منقسم نہ کر سکے ادھر تیمور کو فوری طور پہ سنگاپور جانا پڑ گیا۔ وہ انوشہ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ راضی تو نہیں تھی مگر مہوش بھابھی نے اسے ڈرا دیا۔

"بیٹی کی خاطر ازدواجی زندگی کو داؤ پہ لگا دو گی اگر اس مرحلے پہ تم نے بے رخی برتی تو ساری زندگی کے لیے تیمور کی نگاہ میں معتوب ٹھہرو گی۔" جانے سے پہلے انوشہ نے ایک بار پھر علیزا کو ساتھ لے جانے کے لیے راضی کرنا چاہا مگر وہ نہ مانی۔

رات انوشہ ادھر ہی رکی کہ شاید اسے اپنے پاس دیکھ کر علیزا کے دل میں ماں کی محبت جاگ اٹھے۔ جب سونے کا وقت آیا تو وہ چپ چاپ آ کر رملہ کے پاس لیٹ گئی۔ ماں کے پاس سونا بھی اسے گوارا نہیں تھا کیونکہ اس کے تیور یہی گواہی دے رہے تھے۔ علیزا کے سونے کے بعد

رملہ انوشہ کے بستر پہ آ گئی جو تکیہ آنکھوں پہ رکھے بے آواز رو رہی تھی۔

"آپی" اس نے دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر اس کا رخ اپنی طرف کیا "آپی مت روئیں مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ روئیں گی تو میرا حوصلہ بھی ٹوٹ جائے گا۔" وہ دلسوزی سے بولی تو انوشہ نے آنسو دوپٹے سے پونچھے۔

"ایک مزے کی بات بتاؤں۔ بڑی بھابھی کو شاید اپنی گزشتہ غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے کیونکہ مجھ سے وہ اتنے اچھے طریقے سے پیش آتی ہیں یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے کیے پہ نادم ہوں انہوں نے زبان سے تو اقرار نہیں کیا ہے پر ان کے رویے سے شرمندگی جھلکتی ہے۔ علیزا سے بھی اتنے پیار سے پیش آتی ہیں گھر کے فالتو کاموں کے لیے ایک ماسی بھی رکھ لی ہے تاکہ مجھ پہ زیادہ کام کا بوجھ نہ پڑے۔ میری تو آدھی سے زیادہ فکریں کم ہو گئی ہیں۔ لگتا ہے وہ برے مشکل دن ختم ہو گئے ہیں۔ اللہ نے مہوش بھابھی کے دل میں رحم ڈال دیا ہے۔ یہی حال روشی بھابھی کا ہے۔ مہوش بھابھی نے علیزا کو ڈھیروں فراکیں اور شوز دلوائے ہیں۔ اب تو علیزا بھی ان سے بہت اٹیچ ہوتی جا رہی ہے۔"

"اچھا!" انوشہ کے لیے یہ انکشافات خاصے ناقابل یقین تھے رملہ کی طرح اسے بھی آسودگی و کشادگی کا احساس ہوا۔

"رملہ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ اب میں آرام سے تیمور کے ساتھ جاؤں گی۔ علیزا کی طرف سے میں ہنوز فکرمند ہوں۔ اتنی سی بچی اور اتنا شدید ردعمل۔ میں بہت ہرٹ ہوئی ہوں۔ سوچتی ہوں تیمور کے ساتھ میری شادی کا فیصلہ ٹھیک نہیں ہے شاید۔"

"آپی پلیز" ایسی بات مت کریں جو ہوا اچھا ہوا۔ شاید اس میں کوئی مصلحت ہو۔ اب آپ آرام سے سو جائیں، اچھے اچھے خواب دیکھیں۔" وہ اس کے پاس سے اٹھ کر سوئچ بورڈ کے قریب آئی اور ٹیوب لائٹ بند کر دی۔ انوشہ رملہ کی تسلی دلاسوں کے باوجود نیند نہیں آئی آخر اس کے سینے میں ایک ماں کا دل دھڑکتا تھا۔

❁

تیمور نے انوشہ کے ساتھ مل کر تمام ضروری سامان کی پیکنگ کر لی تھی اب وہ تھی کہ مسلسل رو رہی تھی۔ تیمور تو چپ کرا کرا کر عاجز آیا ہوا تھا۔

"بابا! تین ماہ کے لیے ہی تو جا رہے ہیں۔ کوئی تین صدیوں کے لیے تو نہیں۔ میرا

جانا بہت ضروری ہے اگر تم نہیں جانا چاہتیں تو تمہاری مرضی ہے ویسے جرمنی سے اکا بھائی کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے میں جلد پاکستان آؤں گا۔ میں نے کہا آپ جب بھی آئیں گھر حاضر ہے کیونکہ ان کے جانے سے پہلے ہم اکٹھے رہتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں نے اپنے آبائی گھر کی خوب صورتی و حسن کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ گھر میں نے پلٹس پوائنٹ آف ویو سے بنایا ہوا ہے ہمارا اپنا گھر زیادہ اچھا ہے شادی کے بعد اکا بھائی تھوڑے عرصہ ہی یہاں رہے۔ اب تو کافی برس گزر گئے ہیں۔ غم روزگار نے ان کی مہلت ہی نہیں دی کبھی ان کی طرف چکر لگا آؤں۔ انوشہ ایک بات سوچتا ہوں میں اگر تم مائنڈ نہ کرو تو۔"

وہ رک گیا۔ بھائی کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے چہرے اور آنکھوں سے بس اکا بھائی کی محبت جھلک رہی تھی۔ انوشہ رونا بھول کر دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"ہاں کہیں اب ایسی کون سی بات ہے جو میں مائنڈ کروں گی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"انوشہ در اصل میں شروع سے ہی اکا بھائی کے بہت قریب رہا ہوں چاہتا ہوں جب وہ پاکستان آئیں تو ہم دونوں بھائی اپنے آبائی گھر میں اکٹھے رہیں۔ یہ میری دیرینہ خواہش ہے کہ ہم دونوں بھائیوں کی فیملیز مل جل کر سکون و محبت سے رہیں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کیا میں ایسا کر سکتا ہوں۔" وہ امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش ہوگئی اتنے بڑے گھر کی تنہائی کی وہ عادی نہیں ہوئی تھی یہ تو خوش آئند بات تھی تو وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

علیزا سے ملنے کے بعد وہ دونوں ایئر پورٹ گئے جہاں ان کے ساتھ گھر کے دوسرے افراد بھی تھے۔ علیزا ایئر پورٹ کی گہما گہمی کو دیکھ رہی تھی ماں کی اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ انوشہ نے زبردستی خود سے لپٹا کر اسے پیار کیا پھر بھی اس کا جی نہیں بھرا، جاتے جاتے وہ بار بار مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ رستے بھر اس کا دل بے قراری پر روتا آرہا تھا۔ نوشہ نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو اس نے علیزا کو گود میں بھر لیا۔ سعد بھائی آج فارغ تھے۔ علیزا اور دوسرے بچوں کو گاڑی میں گھمانے لے گئے۔ دوسرے روز سعد مہوش کے ساتھ جاکر اسے اسکول ایڈمٹ کرا آئے۔ دو تین دن تو وہ روئی کہ سکول نہیں جانا پھر بہل ہی گئی۔

❁

حیدر کے ایک جاننے والے کے توسط سے رملہ کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا تھا رملہ کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا ویسے بھی وہ تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا غلغلہ

ہو گیا۔ انوشہ اور تیمور کو گئے چار ماہ سے زائد گزر چکے تھے۔ تیمور نے فون کر کے بتایا تھا کہ فی الحال وہ نہیں آ سکتے دیکھتے ہی دیکھتے پورا سال گزر گیا۔ اب علیزا مونٹیسوری سے نرسری میں آ گئی تھی۔ انہی دنوں انوشہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو تیمور نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے سنگاپور میں چلتے بزنس پہ توجہ دے گا۔ انوشہ بیٹے کی ولادت کے فوراً بعد سفر کرنے کے قابل نہیں تھی کیونکہ بیٹا سیزر آپریشن کے بعد پیدا ہوا تھا۔ سعد نے ان کے آنے کا انتظار نہیں کیا اور رملہ کی شادی طے کر دی۔ پنکی اور سمکی بھی چھٹیوں پہ گھر آئی ہوئی تھیں۔ سجان فارغ تھا لہذا بہت مناسب وقت تھا چنانچہ انوشہ کے بغیر ہی تمام رسمیں سرانجام پا گئیں اور رملہ اپنے گھر سدھاری۔ وہ بیاہ کر خانیوال گئی تھی۔ میکے سے اچھا خاصا فاصلہ تھا شروع کے دنوں میں تو وہ چکر لگاتی رہی۔ اب اس نے بھی آمد و رفت کم کر دی تھی ذیشان کی نوکری کا جو معاملہ تھا وہ آئے روز کئی کئی گھنٹے صرف کر کے رملہ کو میکے نہیں لا سکتا تھا ویسے بھی وہ اپنی گرہستی میں مطمئن اور مسرور تھی۔

⊛

اس روز علیزا سے کھیلتے ہوئے سجان کے کمرے میں رکھا گیا گلدان ٹوٹ گیا تو سجان نے اسے بڑی بیدردی سے مارا اس کے پورے چہرے پہ سجان کے ہاتھوں کی انگلیاں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ روتی ہوئی بی بی کے پاس چلی آئی تو انہوں نے ایک اور تھپڑ اسے لگایا۔

”خبردار جو اپنے ماموں سے شکایت لگائی۔ میں زبان کاٹ ڈالوں گی کتنی کہیں کی۔ ماں خود تو شادی رچا کر بیٹھ گئی اور اس روگ کو میرے لیے چھوڑ گئی۔ میں تمہارا حشر کر دوں گی۔

مہوش کے چہرے سے نقاب سرک چکا تھا۔ علیزا کا ذہن گویا یک دم اندھیرے سے اجالے میں آیا۔ اتنے دن مہوش کے ٹرانس میں رہنے کے بعد وہ آج اپنے آپ میں واپس آئی تھی۔

”مما کہاں ہیں۔ میں مما کے پاس جاؤں گی۔“ علیزا مہوش کے اس نئے روپ سے خوفزدہ ہو گئی۔

”مما کے پاس تو میں تمہیں ایسا بھیجوں گی کہ یاد کرو گی۔ وہ میرے قبضے سے نکل گئی ہے پر تمہیں میں نہیں جانے دوں گی۔ اگر آئندہ مما کا نام لیا تو زبان کاٹ ڈالوں گی اور ماموں سے شکایت لگائی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ مہوش کی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ علیزا کے آنسو آنکھوں ہی میں جم کر رہ گئے تھے

⊛

مہوش نے پوری طرح علیزا کے ذہن اور شخصیت کو مسخ کیا تھا۔ اسے قدم قدم پہ کچلا تھا یونہی وقت گزرتا رہا نہ جانے کتنے برس گزر چکے تھے، اسے مما کا انتظار کرتے ہوئے، اب تو اس کے دل میں کوئی امید بھی باقی نہ رہی تھی بس ذہن میں مبہم سے خلا کا احساس ہوتا تھا۔

اس کی عمر کے ساتھ ساتھ سجان کا خوف بھی پروان چڑھتا رہا۔ مہوش نے کبھی سجان کی حرکتوں کا نوٹس ہی نہیں لیا اور علیزا خوف کی چکی میں دن رات پستی رہی۔

ان کا گھرانہ اب خاصا آزاد خیال ہو گیا تھا۔ ان کا رہن سہن، بول چال اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اپ ٹو ڈیٹ ہو گیا تھا۔

سجان گاڑی لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل آیا۔ گاڑی میں حسب معمول ہیجان خیز میوزک بج رہا تھا۔ وہ مال روڈ کی پر ہجوم سڑک پہ گاڑی چلا رہا تھا، اسے بھوک لگ رہی تھی۔ وہاں جو سے کی یہ دکان خاصی مشہور تھی لوگ فیملیز کے ساتھ وہاں بڑے کھانے آتے تھے۔ خالی ٹیبل کے گرد کرسی گھسیٹ کے وہ بھی بیٹھ گیا۔

"رخشی کی بچی! تم نے میری پلیٹ میں اتنی ڈھیر ساری مرچیں جھونک دی ہیں۔ مجھ سے تو کھایا ہی نہیں جا رہا ہے۔" روہانسی سی آواز پہ سجان کی نگاہ بے اختیار سامنے بیٹھی دو لڑکیوں کی طرف اٹھ گئی اور پھر جیسے پلٹنا بھول گئی۔

لڑکی کی بے پناہ خوب صورتی نے اسے مبہوت کر دیا۔ وہ بے اختیار ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے گیا۔ رخشی نے رانیہ کو ٹہوکا دیا۔

"کیا ہے؟" اسے ابھی تک رخشی پہ غصہ تھا جس نے اس کی پلیٹ میں مرچیں ڈال دی تھیں۔

"وہ سامنے دیکھو، ایک ہیرو تمہیں دیکھ رہا ہے۔" رانیہ نے اس کی انگلی کی سمت دیکھا۔ سجان کی نگاہوں میں اتنی گرمی تھی کہ وہ نظر چرانے پہ مجبور ہو گئی۔

"پتہ نہیں کون بدتمیز ہے۔" وہ آہستہ آواز میں بڑبڑائی۔

"دیکھ ایسے رہا ہے جیسے آنکھوں آنکھوں ہی میں سالم نگل جائے گا۔" اس نے پیٹھ موڑ لی۔ سجان اس پہ مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا، جونہی وہ بل ادا کر کے باہر نکلیں سجان بھی اٹھ آیا۔

"مس! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔" وہ گاڑی کے پیچھے سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان دونوں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ رانیہ اس

کی جرات پر ششدر رہ گئی۔

"...... سے آپ کا۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں جو ہر ایرے غیرے کو اپنا نام
نہاں چھوڑ دوں گی۔" رانیہ کا چہرہ لال ہو گیا۔

"میں بھی کوئی ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے گفتگو
کریں۔" اس کے سادہ و مضبوط لہجے پر رانیہ اس کی شخصیت دیکھ کر رہ گئیں۔

رانیہ ایک ریٹائرڈ جج احمد مقبول کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی جس کی ہر ضد پوری کی
جاتی تھی۔ رانیہ کو سجان پہلی ملاقات ہی میں اپنی جرات اور خود اعتمادی کی وجہ سے بہت اچھا لگا تھا
اور اسی جذبے کی وجہ سے وہ اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ ان دونوں کی مسلسل ملاقاتیں جاری
تھیں سجان نے رانیہ کے حسن کی تعریف اس انداز سے کی تھی کہ وہ اس کی گرویدہ ہو گئی تھی سجان
کے سوا اسے اب کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا سجان نے بہت جلد اپنی والدہ اور والد کو ان کے گھر لانے
کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی کسی مست بے پروا تتلی کی مانند۔

"سجان! میں کپڑے کون سے پہنوں، کل آپ کی مما ہمارے گھر آ رہی ہیں۔" وہ
سجان سے پوچھ رہی تھی۔

"تم کچھ بھی پہن لو تم پہ ہر رنگ اور ہر لباس تم پر جچتا ہے۔ میری نگاہوں سے پوچھو جو
تمہیں دیکھتے ہی بہکنے لگتی ہیں۔" وہ بیباک ہوا جا رہا تھا۔ رانیہ کا گلابی چہرا سرخ ہو گیا۔

احمد مقبول ایک باشرع خاندانی آدمی تھے۔ نوکری بھی رعب و دبدبے والی کی تھی مگر اپنی
اکلوتی بیٹی رانیہ کے معاملے میں وہ بہت حساس تھے۔ رانیہ کے لیے ان سے بڑھ کر کوئی نرم دل
اور مشفق نہیں تھا۔ وہ بھی بہت خوش تھیں کیونکہ مقبول صاحب کا بڑا نام تھا۔ سجان کے پروپوزل دے
دیے گئے تھیں اب ادھر سے منظوری ملنے کے بعد ہی باقی کا لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ احمد مقبول نے
مطمئن ہونے کے بعد سجان کو او کے کر دیا۔ اب دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں جاری
تھیں۔ شہنائیوں کی گونج میں رانیہ دلہن بن کر سجان کے گھر آنگن میں وارد ہوئی۔

مختلف رسموں کا ایک طویل سلسلہ تھا جس سے نمٹنے کے بعد رانیہ کو آرام کرنا نصیب
ہوا۔ سیمی کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج اسے بڑے سکون کی نیند آئے گی کیونکہ سجان کی قربت
سے اسے رہائی مل گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ عجیب اذیت ناک، دل دہلا دینے والا سلوک کرتا
تھا۔ اذیت کی انتہا پہ پہنچا کر آواز بھی نہیں نکالنے دیتا تھا۔ ایک بار اس نے علیزا کے منہ پہ ٹیپ

چپکا کر سگریٹ سے اس کا بازو داغ دیا تھا۔ وہ ایسا ہی جنونی اور اذیت پرست تھا۔ علیزا نے کئی بار سوچا جب رملہ آنی آئیں گی تو وہ انہیں بتائے گی۔ سال میں وہ ایک آدھ بار ہی آتیں۔ مگر انہیں دیکھ کر جانے کیوں علیزا کے منہ پہ چپ کے تالے پڑ جاتے۔ سجان کے خیال بھوت کہیں سے نکل کر سامنے آ کھڑا ہوتا۔

"اگر کسی کو بتایا تو میں زبان کاٹ دوں گا۔ آنکھیں نکال لوں گا۔" وہ اسے ڈراتا تو علیزا صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ اس بے فکر عمر میں ہی وہ صبر و ضبط کے کڑے مراحل طے کر چکی تھی۔

رانیہ کی نگاہ دیوار گیر گھڑیال کی طرف اٹھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ قدموں کی آہٹ اسی کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ سجان کی آمد کے تصور نے اس کے دل کو گدگدانا شروع کر دیا۔

سجان نے آتے ہی بیڈ روم ریفریجریٹر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگائی۔

"کتنی ویران اسٹوپڈ سی رسموں میں ہو گئی۔ کسی کو پتہ ہی نہیں ہے، میرا وقت کتنا قیمتی ہے۔" وہ بے حد غصے میں تھا۔ رانیہ نے ذرا کی ذرا اس کی سمت نگاہ اٹھائی اور پھر جھکا لی۔

❁

چنکی اور سمکی دونوں بہنیں تعلیم سے فارغ ہو چکی تھیں۔ ان دونوں کا زیادہ وقت گھومنے پھرنے یا بیٹھے گلے میں ضائع ہوتا۔ گھر میں ہوتیں تو فون سے چپکی رہتیں۔ دونوں مہوش کی طرح آرام طلب اور زبان دراز تھیں۔ روشی کے بیٹے عفان اور منال بھی جوان تھے۔ ان دونوں بہن بھائی کا سلوک علیزا کے ساتھ مخلصانہ تھا۔ خود روشی کو اپنی پست خیالی کا احساس ہو چکا تھا۔ اگر وہ مہوش کو اس کی خود غرضی یا بے حسی پہ ٹوکتی تو وہ اس کی جان کو آ جاتیں۔ مجبوراً وہ چپ ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ وہ مہوش کی حرکتوں سے لاتعلق سی ہو گئی۔ عفان اور منال پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے۔ زیادہ وقت اسی میں مصروف رہتے۔ روشی علیزا تو وہ مہوش کے ساتھ رہتی تھی۔ مہوش اس پہ زرخرید لونڈی کی طرح حکم چلاتیں۔ عدم تحفظ، تنہائی، بے چارگی اور اکیلے پن کے احساس نے علیزا کی شخصیت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ دو آدمیوں کے سامنے وہ بات تک نہیں کر سکتی تھی۔ چنکی اور سمکی اس کا بری طرح مذاق اڑاتیں۔ اسی پہ بس نہیں تھا۔ وہ اپنے دوستوں اور سہیلیوں کے سامنے بھی یہ رویہ اپنائے ہوئے تھیں۔

انوشہ کا فون مہینے میں تین چار بار آتا اور وہ علیزا سے بات چیت کی خواہش کا اظہار کرتی تو مہوش سفید جھوٹ بولتیں۔

''وہ تو تمہارا نام بھی نہیں سننا چاہتی۔ کہتی ہے جب مجھے اس کی گود کی ضرورت تھی تو ماں شادی رچا کر بیٹھ گئی۔ اب مجھے فون مت کیا کرے۔ ویسے علیزا مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔''

وہ بتاتیں تو انوشہ مارے شرم کے گویا زمین میں گڑ کر رہ جاتی کہ علیزا اس کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتی ہے۔ مہوش بہت کم علیزا کو انوشہ کے فون کے بارے میں بتاتیں اگر علیزا فون پر بھی لیتی تو سلام دعا کے سوا اس کے لبوں سے کوئی اور بات نکلتی ہی نہیں۔ یہ اور بات تھی کہ اس کا دل فون کی بیل ہی میں اٹکا رہتا اور جو وہ فون ریسیو کر لیتی تو برسوں سے ذہن میں بیٹھی مہوش کی باتیں گونجنے لگتیں، وہ کیسے انوشہ کو اپنے دل کا حال بتائی۔

انوشہ کے دو بچے تھے۔ دونوں بیٹے تھے۔ ان میں محبت تقسیم ہو جانے کے باوجود بھی اسے اپنی ممتا کے پیاسے ہونے کا احساس رہتا۔ پندرہ طویل برس گزر چکے تھے علیزا کو دیکھے بغیر۔ اس نے تیمور پر زور دینا شروع کر دیا کہ بزنس وائنڈ اپ کر کے پاکستان چلیں۔ ادھر اکا بھائی بھی تیمور پر مسلسل زور دے رہے تھے ''اب پاکستان چلے آؤ میں بہت تھک گیا ہوں۔'' ویسے بھی اب وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ رمشہ اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ رہ گیا بیٹا وہ اپنی نوکری میں مصروف تھا۔ اس بری طرح کہ شادی کے سوال پہ دامن بچا جاتا۔ سو وہ گھر کی تنہائی سے گھبرا گئے تھے۔ زیادہ جی گھبراتا تو سال میں ایک دو بار تیمور کی طرف چلے جاتے۔

❁

گھر میں بہت خاموشی اور سکون تھا۔ سجان رانیہ کو لے کر گھومنے پھرنے نکل گیا تھا۔ پنکی اور سمکی آئے روز اپنی فرینڈز کے ہاں پارٹیز میں شریک ہوتیں۔ ایسے میں علیزا کو بہت اچھا لگتا جب گھر میں کوئی بھی نہیں ہوتا تو وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرتی اسے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ اسے شاعری اور مطالعے سے بہت دلچسپی تھی۔ لائبریری سے کتابیں لے کر آتی اور فارغ اوقات میں پوری طرح کتابوں کی دنیا میں گم ہو جاتی۔ مہوش کا بی پی زیادہ تر ہائی ہی رہتا۔ وہ اپنے کمرے میں سوئی رہتیں یا ڈاکٹرز کے ہاں چکر لگاتیں۔ آرام ہی نہیں آتا تھا۔ سعد ڈانٹتے کہ تم بدپرہیزی کرتی ہو۔ وہ لڑنے پر اتر آتیں۔ علیزا اس جھک جھک بک بک سے بے نیاز اپنے خوابوں میں گم ہو جاتی جو اس کے لیے گوشۂ عافیت اور سہانے مستقبل کے امین تھے۔

فروا نے پنکی اور سمکی دونوں کو بلوایا تھا۔ پنکی تو سخت بے چین تھی۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جس کے لیے فروا نے ابھی اور اسی وقت پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

''چھوڑو بھی کچھ مت سے۔'' ہنی نے بالآخر فروا سے پوچھ ہی لیا۔

''ابھی نہیں بتاؤں گی۔ دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔'' اس نے انہیں چڑایا اور ہنی نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

''ٹھیک ہے نہ بتاؤ۔ میرے پاس بھی ایک بمباسٹک نیوز ہے۔'' پنکی نے بے نیازی سے شانے اچکائے تو فروا کا اشتیاق کچھ اور بھی سوا ہو گیا۔

''پلیز بتاؤ ناں۔ تاکہ پراسس چکر میں بھی تم سے اپنا سیکرٹ شیئر کروں گی۔''

''نہیں پہلے تم پنکی۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی تو فروا کو ہار ماننا پڑی۔

''وہ میرا کزن ہانی ہے ناں۔ اس نے مجھے سلیمان سے ملوایا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی جیسے ان کے اشتیاق کو ہوا کر رہی ہو۔

''اب آگے بھی بتاؤ۔ یہ سلیمان کون ہے۔'' ہنی نے دخل دیا۔

''بڑی اونچی چیز ہے یہ سلیمان۔'' اس نے ''اونچی'' چیز پر زور دیتے ہوئے اپنی ستواں ناک سکوڑی۔

''خوامخواہ تم سسپنس کری ایٹ کر رہی ہو۔'' ہنی بور ہو گئی۔

''سنڈے کو مری برتھ ڈے ہے۔ سلیمان بھی انوائیٹ ہے وہاں تم دیکھ لینا میں اتنا سسپنس کیوں کری ایٹ کر رہی ہوں۔''

''چلو دیکھ لیں گے تمہارے سلیمان کو بھی۔ ویسے ایک بات کہوں مائنڈ مت کرنا، تم تو حماد کو بھی بڑی اونچی چیز کہتی تھیں۔ موٹا پہاڑ لگا چڑھا اور وہ بھی مرا ہوا۔'' ہنی نے نامحسوس سے انداز میں طنز کیا تو فروا کی بھنویں تن گئیں۔

''تم میری توہین کر رہی ہو ہنی! میری طبیعت کا تمہیں پتہ ہے۔ میں کتنی جلدی دوسروں سے متاثر ہو جاتی ہوں۔ حماد بھی ان میں سے ایک تھا بعد میں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ خوامخواہ گلے پڑ جاتا تھا پر سلیمان جیسا لڑکا میں نے کبھی پہلے دیکھا ہے۔'' وہ ایک جذب سے بولی تو ہنی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

اس روز ہنی کے حق میں جانے کیا سمائی کہ علیزا کو بھی برتھ ڈے پارٹی میں اپنے ساتھ جانے کو کہا۔ ہنی نے ناک بھوں چڑھائی۔

''یہ مت سمجھنا کہ میرے دل میں یکایک اس کی محبت بیدار ہو گئی ہے ایسی کوئی بات

نہیں ہے۔علیزا ساتھ جائے گی تو دیکھے گی ہمارا کتنے اونچے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔اس پہ رعب پڑے گا،مزید احساس کمتری کا شکار ہوگی۔" ہمکی اس کی منطق پہ خاموش ہوگئی۔

فروا کے گھر جا کر علیزا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔وہ بہت کم کہیں جاتی تھی۔رنگ و بو کی یہ دنیا اس کے لیے نئی تو نہیں مگر نا آشنا ضرور تھی۔ہمکی اور چنکی اپنی اپنی دلچسپیوں اور دوستوں میں مگن ہوگئیں۔علیزا ایک طرف بیٹھی حیرت سے دیکھتی رہی۔لڑکیوں کے لباس،ان کی باتیں،انکے انداز اسے سب کچھ ہی عجیب لگ رہا تھا۔ساری محفل میں اسے اپنی پسند کی ایک شخصیت بھی نظر نہیں آئی۔جوں جوں وقت گزر رہا تھا لڑکیاں بے چین دکھائی دے رہی تھیں شاید انہیں کسی کی آمد کا انتظار تھا۔خاص طور پر فروا جس کی سالگرہ تھی۔بار بار گیٹ کی جانب متلاشی انداز میں دیکھ رہی تھی۔حسن کے سارے ہتھیاروں سے لیس وہ جان محفل لگ رہی تھی۔پھر وہ شخصیت آ ہی گئی جس کا ان سب کو انتظار تھا۔علیزا ابھی دیکھ رہی تھی ایک مرد کے لیے لڑکیوں کا یہ جوش و خروش اسے اچنبھے میں ڈال رہا تھا۔کیک کٹنے کا وقت آیا تو فروا نے علیزا کو بھی پاس بلا لیا تب اس نے غور سے اس لڑکے کو دیکھا۔کڑکڑاتے سفید لٹھے کے شلوار سوٹ میں کشمیری دھسہ کندھوں پہ ڈالے وہ باقی لڑکوں سے ذرا الگ تھلگ نظر آرہا تھا کیونکہ پوری محفل میں موجود لڑکوں میں سے صرف اسی نے شلوار سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔فروا اس کے آگے پیچھے پھر رہی تھی۔خود چنکی اور ہمکی بھی اس میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ہمکی نے فروا کی برتھ ڈے پہ باقی دوستوں کی فرمائش پہ کلاسیکی رقص پیش کیا۔دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ہمکی چند ماہ میں ہی اعضاء کی شاعری میں طاق ہوگئی تھی جبکہ چنکی کوشش کے باوجود ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ملی تھی وہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے چکر بھی لگا چکی تھی۔کہیں شنوائی نہیں ہوئی تھی اپنے تئیں تو وہ بہت بڑھکیں مارتی تھی کہ مجھے ماڈلنگ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔آج ہمکی کی پذیرائی پہ اسے دل میں پہلی بار حسد سا محسوس ہوا۔

مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہورہے تھے۔فروا کا خاص الخاص مہمان ان تینوں سمیت ابھی تک وہیں تھا۔چنکی اس سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کررہی تھی۔ان کے درمیان علیزا خود کو مس فٹ محسوس کررہی تھی۔خدا خدا کرکے چنکی اور ہمکی نے فروا سے رخصت چاہی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔گاڑی میں بھی موضوع گفتگو سلیمان کی ذات تھی۔

"تم نے دیکھا۔فروا کیسے سب سے اس کا انٹروڈکشن کرارہی تھی جیسے سلیمان اس کی

جاگیر ہو مگر سلیمان اسے گھاس ڈالنے والوں میں سے نہیں لگ رہا ہے۔ کتنی بے نیازی سے بیٹھا ہوا تھا۔ فروا پہ بس ایک عام سی نگاہ ڈالی اس نے اور وہ چھچھوری لڑکیوں کی طرح اس کے قدموں میں گویا بچھی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں جانے کیوں فروا سے اتنی جلی بھی ہوئی تھی۔ سمکی خاموشی سے تکتی رہی۔ کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ وہ اس وقت سلیمان کے بارے میں کسی اور ہی انداز سے سوچ رہی تھی۔ وہ سلیمان کو اپنے ہاں دعوت پہ بلائے گی۔ فروا کی دوست ہونے کے ناتے وہ یقیناً اس کی دعوت قبول کرے گا۔

❁

بکھرتی زندگی کی بن بیاہی خواہشیں

اب چیونٹیاں بن کر

مرے کل کے تصور کے بدن کی ہڈیاں تلکھا رہی ہیں اور نہ جانے اب یہ سانسیں کہاں سے آ رہی ہیں۔

وہ جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس کی تیسری منزل سے ارد گرد کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا تھا مگر رانیہ جسے پہلے ان قدرتی مناظر اور خوب صورتی سے بالکل اپنے وجود کی طرح پیار تھا۔ اب ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی روح مر چکی ہو اور وہ بے جان جسم رہ گئی ہو۔ سسکتے تڑپتے بے جان جسم سمیت۔ اس وقت بھی وہ کارپٹ پہ بیٹھی بمشکل اپنی چیخیں روکنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ سجان لاتعلقی سے کھڑکی سے باہر کے مناظر میں گم تھا۔

سجان رانیہ کے ساتھ ہنی مون سے واپس آ گیا تھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن لگ رہا تھا جبکہ رانیہ بجھی بجھی اور پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی گلابی رنگت میں سیاہی جھلک آئی تھی۔

علیزا کی رات کو اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ بہت خوفناک خواب دیکھ رہی تھی۔ آنکھ کھلی تو وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی اور حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ وہ دوپٹہ کندھے پہ ڈالتی بال درست کرتی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے دھیمی دھیمی سسکیوں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اونچی آواز میں بولی۔

"کون ہے...؟" اس کی آواز پہ سسکیاں یکدم تھم گئیں۔ علیزا نے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر لائٹ جلا دی۔ وہ رانیہ تھی جو اپنی آنکھیں دوپٹے سے رگڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اور

ذہن سے لگ رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے رو رہی ہے۔ علیزا تیزی سے اس کے پاس آئی۔

”بھابھی! کیا بات ہے؟“ اس نے بے اختیاری رانیہ کے دونوں بازو تھامے تھے۔ اس نے جھکی جھکی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

”بھابھی! بتائیں ناں کیا بات ہے؟“ رانیہ نے کچھ کہنے کے بجائے اپنا بازو اس کے سامنے کر دیا۔

”اف۔“ علیزا تھرا سی گئی۔ رانیہ کا انتہائی سفید شفاف دودھیا بازو سگریٹ سے جگہ جگہ داغا ہوا تھا۔ دانتوں سے کاٹنے کے نشانات بھی واضح تھے جو خاصی گہرائی تک جلد میں چلے گئے تھے۔ ان کی وجہ سے زخم بنتا جا رہا تھا۔

”علیزا! ان نشانات، ان زخموں پہ ہی کیا موقوف، میرا تو پورا وجود اذیت ناک زخموں سے اٹ گیا ہے۔ کاش میں تمہیں دکھا سکتی۔“ وہ سسکی۔

”یہ سب کیسے ہوا؟“ اسے قصداً لاعلمی ظاہر کرنا پڑی۔ اسے پتہ تھا رانیہ کا جواب کیا ہوگا۔

”علیزا! اس گھر میں سب کے چہرے نقاب میں پوشیدہ ہیں۔ ایک تم ہو جو سب سے الگ نظر آتی ہو۔ تمہیں بتانے میں، میں کوئی حرج نہیں سمجھتی کہ سجان ایک اذیت پرست، وحشی مزاج اور نفسیاتی مریض ہے۔ اس سے شادی میری اپنی پسند سے ہوئی تھی۔ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔ سجان کس پست درجہ اخلاق کا مالک ہے پتہ نہیں میں نے کون سا گناہ کیا تھا جس کے نتیجے میں یہ عذاب بھگتنا پڑ رہا ہے۔ وہ مجھے اس بے حیائی اور بے شرمی سے اپنے اخلاق سے گرے کارنامے سناتا ہے کہ جو بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں روشن خیال ہوں مگر آزاد خیال نہیں ہوں۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ......“

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھر رونے لگی۔ علیزا کے ساکت وجود کے اندر ایک جوار بھاٹا سا اٹھا۔ سجان کی حرکتوں سے وہ دیدہ و دانستہ چشم پوشی اسے اس انتہا تک پہنچا دے گی اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ وہ تشدد پسند تھا اور اس کا یہ تشدد دانستہ صرف صنف نازک تک ہی محدود تھا۔ ممی سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا مگر انہوں نے دانستہ خود کو [illegible] کیا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے روشی نے اپنا پورشن علیحدہ کر لیا تھا۔ اس کی بھی ایک بیٹی تھی۔ اس نے پیش بندی کے طور پر اپنا حصہ الگ کر کے درمیان میں دیوار کھڑی کر لی تھی سجان کی حرکتوں کی وجہ سے وہ اسے سخت

ناپسند کرتی تھی اسی باعث دونوں بہنوں کے تعلقات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ روشی نے کئی بار آپا سے کہا کہ سجان کی حرکتوں کا نوٹس لیں۔ اسے پیار و ڈانٹ ڈپٹ سے سمجھائیں۔ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کے پاس جائیں ورنہ کل کلاں کو وہ ناقابل تلافی نقصان اٹھائیں گی مگر مہوش کہاں کسی ایسی نصیحت کو خاطر میں لانے والی تھیں۔ الٹا روشی پہ چڑھ دوڑیں۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ مہوش سجان کی ان بیمار ذہنیت والی حرکتوں کو جوانی کی شرارتیں کہتی تھیں۔ روشی نے اب مناہل کی نچلے پورشن میں آمد بند کی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مہوش مکمل طور پر ناراض ہو گئی تھیں۔

وقتاً فوقتاً جب سجان گھر میں اکیلا ہوتا تو روشی آواز دے کر علیزا کو بھی اپنے پاس بلا لیتی جب تک وہ موجود رہتا۔ وہ اسے اپنے پاس بٹھائے رکھتی۔ اپنی بیٹی کے جوان ہو چکنے کے بعد وہ بہت حساس ہو گئی تھی اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگی تھی کہ اب علیزا کو اپنی ماں کے پاس چلے جانا چاہیے۔ وہ جوان و خوب صورت تھی۔ سجان کی کمینی اور گندی فطرت سے کچھ بعید نہ تھا۔ پرائی بیٹی کی ذمہ داری کوئی کب تک اٹھا سکتا تھا۔ کئی بار جب بھی انوشہ سے فون پہ بات چیت ہوتی تو وہ ڈھکے چھپے انداز میں کہتی۔ اب واپس آجاؤ علیزا تمہیں بہت مس کرتی ہے۔ ظاہر ہے وہ واشگاف الفاظ میں تو نہیں کہہ سکتی تھی ادھر انوشہ خوش ہو جاتی مگر اس وقت دل مسوس کر رہ جاتی جب مہوش بھابھی روشی کے بالکل متضاد کہتیں۔

”بھابھی! اب آپ سو جائیں۔ بہت رات ہو گئی ہے۔“ علیزا نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے جو ماضی میں سفر کرتے ہوئے اس کی آنکھ میں در آئے تھے۔

”مجھے سجان کے پاس جانے سے خوف آتا ہے۔“ وہ کرب آلود لہجے میں بولی تو علیزا نے اس کا دکھ اپنے دل و جاں میں اترتا محسوس کیا۔

❁

سمکی نے آج کسی خاص الخاص مہمان کو کھانے پہ مدعو کیا ہوا تھا۔ صبح سے علیزا سمیت سب کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔ ماسی کے سر پہ کھڑے ہو کر اس نے صفائی کرائی۔ صاف دھلے ہوئے برتنوں کو دوبارہ دھلوایا۔ ڈرائنگ ہال کی ترتیب بدلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں نئے پردے لٹکائے گئے تو گھر چمک اٹھا ورنہ تو نوکروں نے برا حال کر رکھا تھا۔ جب گھر کے مکینوں کو ہی پروا نہ ہو تو نوکروں کو کیا پڑی ہے اپنی جان جلاتے پھریں۔

وہ کھانے کی ٹیبل پہ برتن سیٹ کر رہی تھی جب سمکی کے مہمان نے قدم رنجہ فرمایا۔

سب پر تکلف سیں اس کے استقبال کے لیے ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ علیزا چائے بنا کر ٹرالی سجائے ڈرائنگ روم میں آئی۔ اسے بھی مہمان کو دیکھنے کا معصوم سا اشتیاق تھا۔ مہمان فروا کی برتھ ڈے پارٹی والا تھا۔ اسے یہاں دیکھ کر علیزا کو حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ سمکی کی دلچسپی وہ بھانپ چکی تھی۔ چائے دے کر وہ باہر آ گئی۔ اپنے ملگجے کپڑے دیکھ کر اسے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی جو زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ اسے کچن میں مصروف عمل دیکھ کر منال بھی آ گئی۔ علیزا نے تمام چیزیں تیار کر لیں تو بتانے کے ارادے سے ڈرائنگ روم کی طرف آئی سب غائب تھے سوائے مہمان کے۔ وہ ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا باقی نہ جانے کہاں تھے وہ ان ہی قدموں لوٹنے لگی تھی جب فون کی بیل بجنے لگی۔

''ہیلو اسلام علیکم۔'' وہ مری مری آواز میں بولی۔

''کون ہو بیٹا! سمکی ہو کہ پنکی۔ خود ہی بتا دو۔'' انہوں نے اسے پہچانا ہو یا نہ مگر علیزا اچھی طرح پہچان چکی تھی۔

''میں علیزا بات کر رہی ہوں۔ آپ ہولڈ کریں۔ میں ممی کو بلواتی ہوں۔'' وہ بمشکل تمام پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''علیزا اوہ گاڈ! یہ تم ہو۔ میں انوشہ بات کر رہی ہوں تمہاری ماما۔'' دوسری طرف موجود انوشہ کی آواز بھرا گئی تھی علیزا نے سختی سے اپنے ہونٹ کاٹے اور پلکیں جھپک جھپک کر امڈتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

''میں ممی کو بلواتی ہوں۔'' اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

⊛

رانیہ کافی دن سے میکے میں تھی۔ ایسا پہلے نہیں ہوا تھا کہ رانیہ اتنے زیادہ دن ادھر رکی ہو۔ سبحان نے فون کر کے اسے آنے کو کہا۔ نہ جانے ادھر سے کیا جواب ملا جو وہ کف اڑانے لگا۔ پندرہ دن اور گزر جانے کے بعد علیزا کو یوں لگا یہ معاملہ سنجیدہ ہوتا جا رہا ہے اگرچہ اسے کسی نے بتایا نہیں تھا مگر رہتی تو وہ بھی اسی گھر میں تھی پھر ایک جگہ رہتے ہوئے کوئی بات کتنے دن تک چھپی رہ سکتی ہے۔ مہوش فون پہ فون کرتیں۔ سعد سر جھکائے پریشان سے بیٹھے رہتے۔ سبحان غیظ و غضب کے عالم میں کسی غیر مرئی وجود کو یوں دیکھتا جیسے وہ رانیہ ہو۔ سمکی

اور حنی کو اتنی خاص پروا نہیں تھی۔

رانیہ نے سجان سے خلع کا مطالبہ کر دیا تھا جس پہ وہ اور بھی بپھر گیا۔

"میں اس کا وہ حال کروں گا کہ ساری عورتیں پناہ مانگیں گی۔ اسے اپنے حسن پہ بہت ناز ہے نا۔ اکڑتی ہے اپنے آپ پہ۔ خود کو پہچان ہی نہیں پائے گی۔ میں اسے کسی اور کے قابل نہیں رہنے دوں گا۔" وہ خلا میں تکتے ہوئے بڑبڑایا اس حالت میں اس کی آنکھوں سے مخصوص سی دہشت جھانک رہی تھی جس میں شیطانیت تھی۔ مہوش بھی رانیہ کو لعن طعن کر رہی تھیں۔ سعد نے انہیں سمجھایا۔

"رانیہ کو برا بھلا کہنے کا فائدہ نہیں ہے نہ وہ قصوروار ہے۔ حقیقت کا سامنا کرنا سیکھو۔ برائی گھر کے اندر ہو تو باہر والوں کو دوش نہیں دینا چاہیے۔" وہ تلخی سے بولے تو مہوش بھی تلخی سے اکھڑ گئیں۔ اب وہ کہاں چپ ہونے والی تھیں۔ سعد خود رانیہ کے گھر گئے اسے منانے، واپس لانے کے لیے مگر وہ سامنے ہی نہیں آئی۔ احمد مقبول نے صاف صاف کہہ دیا۔

"رانیہ کسی صورت بھی واپس جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔" رانیہ نے اس موقع پہ شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خاندان کے بزرگوں کو درمیان میں لا کر معاملہ ان کے آگے رکھا تھا۔ وہ پڑھے لکھے روشن خیال لوگوں کا گھرانہ تھا اور کوئی بھی اپنی اولاد کو آگ کے سمندر میں دھکا نہیں دیتا۔ سعد کو صاف صاف جواب دے دیا گیا کہ رانیہ کو خلع چاہیے۔ رانیہ کے والدین باشعور تھے خود رانیہ پڑھی لکھی تھی۔

سجان روز رانیہ کو فون کرتا اور گڑگڑاتا کہ گھر آ جاؤ۔ اب میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ ایک ثانیے کے لیے اس کا دل نرم پڑ جاتا پھر اگلے ہی لمحے سجان کا گزشتہ رویہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا تو وہ دل کو سمجھا لیتی۔ سجان کی طرف سے اسے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا تمام وقت ایک ذہنی اذیت و خوف میں گرفتار رہتے ہوئے گزرتا۔ ہر آہٹ پہ وہ چونک اٹھتی۔ رات کو کئی بار اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ چیک کرتی۔ اگلے لان میں بھی نہ جاتی نہ جانے اس نے چھ ماہ سجان کے ساتھ کیونکر چپ چاپ گزار لیے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سجان اس کی زبان سے نکلی والی ہر فرمائش پوری کرتا تھا، اسے خوش نوش شاپنگ کراتا، اسے والدین سے ملوانے لے جاتا۔ اسے سراہتا، تعریف کرتا۔

لیکن نمودار ہوتے ہی اس کے اندر کا درندہ باہر آ جاتا اور رداجیہ کو چیرنے پھاڑنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ میکے میں اس نے کسی کو بھی خود پہ پڑنے والی بپتا کا احوال نہیں بتایا۔ جب اذیت سہنا اس کے اختیار سے باہر ہو گیا تو تب اس نے اپنی خالہ زاد سارا کو بتائی کہ سجان کہتا ہے۔ "تم کبھی بھی ماں نہیں بنو گی۔ یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔" سارا نے یہ تمام باتیں راجیہ کی مما کو بتائیں۔ ان کے ذریعے یہ واقعات خاندان کے معتبر افراد تک پہنچے۔ جس کے نتیجے میں وہ اب والدین کے گھر تھی۔ اس کے روز و شب اب بھی خوف کی وادی پرخار میں آبلہ پا چلتے ہوئے بسر ہو رہے تھے۔

⊛

انوشہ کے تو مارے خوشی کے پاؤں زمین پہ ہی نہیں ٹک رہے تھے۔ تیمور بالآخر پاکستان جانے پہ رضامند ہو گئے تھے۔ وہ اپنا بزنس یہاں سے وائنڈ اپ کر کے اپنے وطن میں سیٹ کرنے کی تیاریوں میں معروف تھے۔ انوشہ خوشی خوشی اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔ اطمینان اور سرشاری نے ان دونوں جیسے اس کے پورے وجود کو سیراب کیا ہوا تھا۔ موئی اور رنی کے سامنے اس نے علیزا کی اتنی تعریفیں اور باتیں کی تھیں کہ انہیں بھی اپنی آپی سے جلد از جلد ملنے کا اشتیاق ہو گیا تھا۔ اکا بھائی از سر نو گھر سیٹ کرا رہے تھے۔ سلیمان کو انہوں نے اپنے آنے کا دن اور وقت بتا دیا تھا۔ سلیمان دوبارہ سنگاپور ان کے پاس مختصر عرصے کے لیے گیا تھا۔ بعد میں ملازمت میں معروف ہونے کے بعد جانے کا موقع ہی نہیں ملا حالانکہ موئی اور رنی اسے بہت مس کرتے تھے۔ انوشہ بھی اسے بہت پسند کرتی تھی۔ اب تو انوشہ کا جی چاہتا اڑ کر اپنی علیزا کے پاس پہنچ جائے۔ دل میں وہ خود کو بھی مجرم گردانتی کہ اس نے نئی زندگی میں کھو کر علیزا کو فراموش کر دیا ہے حالانکہ ایسا کوئی لمحہ کم ہی گزرا تھا جب اس نے علیزا کو یاد نہ کیا ہو۔ موئی اور رنی نے صرف علیزا کے فوٹوگرافس دیکھے تھے جو مہوش کی ہدایت پہ ہر سال بھجوائے جاتے تھے۔ وہ دونوں بھائی بے چینی سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے

⊛

موسم بڑا سہانا ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پہ بادلوں کے جھنڈ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ عصر کا وقت تھا مگر خوابناک ملگجے اندھیرے کی وجہ سے رات کی چھائی محسوس ہو رہی تھی۔ سلیمان ایئرپورٹ پر چچا اور چچی کا انتظار کر رہا تھا۔

سلیمان کا انتظار ختم ہوا۔ وہ چاروں ارائیول لاؤنج سے نکل رہے تھے وہیں سے

ملانے مرحلہ طے ہوا۔ پورٹر نے سلیمان کی گاڑی کی ڈگی میں ان کا سامان رکھا۔ واپسی کا سفر جاری تھا۔ بادلوں کا رنگ اور بھی میلا ہوگیا۔ اکا دکا بوندیں گرنے لگی تھیں۔ انوشہ نے سلیمان کو گاڑی موڑنے کو کہا۔ دراصل وہ سعد بھائی کے ہاں اچانک جا کر سرپرائز دینا چاہتی تھیں، خاص طور پہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ علیزا اسے یوں اپنے سامنے پا کر کس طرح کے ردعمل کا اظہار کرتی ہے۔ تیمور نے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ انوشہ کی یہ ننھی سی خوشی برباد نہیں کر سکتے تھے۔ انوشہ سلیمان کو راستہ بتا رہی تھی۔ کئی نئی عمارتوں اور گلیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے راستہ جاننے میں دقت پیش آ رہی تھی پھر اوپر سے بادلوں کے باعث اندھیرا تھا۔ محکمہ موسمیات نے پیشن گوئی کی تھی کہ شدید بارش ہوگی۔

⊛

علیزا کو گہری طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ آج سب مہوش اور روشی کے ایک عزیز کے ہاں شادی پہ مدعو تھے۔ اس کا پیپر تھا، اس لیے وہ نہیں گئی۔ کالج سے آنے کے بعد وہ لمبی تان کر سوئی اور پھر عصر کے وقت ہی اٹھی۔ اپنے لیے چائے بنائی اور لان میں بیٹھ کر پی۔ موسم اچھا ہو رہا تھا بادل برسنے کو تیار کھڑے تھے۔ اوپر سے گہرا پراسرار آمیز سا اندھیرا اس کی شاعرانہ طبیعت کو بڑا لبھا رہا تھا۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ جو چاہے کر سکتی تھی۔ اسے اپنا آپ بہت آزاد اور ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ کام والی ماسی جا چکی تھی۔ چوکیدار چھٹی پہ تھا۔ وہ اندر آ گئی اور کھڑکی پہ پڑے پردے سرکائے۔ کرسی پہ بیٹھ کر اس نے پلیئر میں اپنے پسندیدہ گلوکار کی کیسٹ ڈالی۔ کرسی پہ نیم دراز اس کا دل ہلکے سے گداز کے زیر اثر آ چکا تھا۔

میں تو جلا ایسا جیون بھر
کیا کوئی دیپ جلا ہوگا
میرے جیسا اس دنیا میں کوئی اکیلا کیا ہوگا
جتنی امنگیں تھیں سب دل میں
ساتھ میرا چھوڑ گئیں

اسے رونا آنے لگا۔ وہ کرسی سے اٹھی اور کیسٹ بدل دی۔
وہ کشن سر کے نیچے رکھ کر بے تکلفانہ وہیں پہ نیم دراز ہوگئی۔

⊛

سجان کی طبیعت نا جتی عمر کی شوخ و شنگ بے پروا سی لڑکیوں کو دیکھ کر عجیب سی ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگا کہ اگر وہ تھوڑی دیر بھی اور یہاں رہا تو کچھ کر بیٹھے گا۔ اس کی حالت اس نشئی کی سی ہو رہی تھی جس کو کافی روز سے اپنے پسندیدہ نشے کی ڈوز نہ ملی ہو اور اس محرومی کے باعث اس کا بدن ٹوٹ رہا ہو۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کاش اس وقت رانیہ اس کے سامنے آ جائے تو وہ اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ اچانک اس کے مایوس ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور آنکھیں اسی درندے کی طرح چمکنے لگیں جسے اچانک غیر متوقع طور پہ شکار نظر آ گیا ہو۔

راستے میں اس نے ایک جنرل اسٹور دیکھ کر گاڑی روکی اور سگریٹ خریدے۔ اس کے بعد اس نے پھر گاڑی روکی اور ایک چھوٹا سا تیز دھار چاقو، سیفٹی پن اور دو چیزیں خریدی۔ چھوٹی قینچی تو اس کی جیب میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ اس نے کوٹ کی دونوں جیبیں تھپتھپا کر ان کی موجودگی کا اطمینان کیا۔ اب اس کے لبوں پہ آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

اسے معلوم تھا۔ شادی کی یہ تقریب کسی طرح بھی آدھی رات سے پہلے ختم نہیں ہوگی اور نہ اس سے پہلے سب واپس آئیں گے۔ مما تو اس پہ بھی اس کے جلدی آنے پہ خفا ہو رہی تھیں۔ آخر ان کی خالہ زاد بہن کی بیٹی کی شادی تھی۔ اسی وجہ سے پورا گھر شریک تھا۔ روشی کی تمام فیملی موجود تھی۔ سجان مہوش کی ایک نہ سنتے ہوئے چپکے سے واپس آ گیا۔

وہ بہت ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے واپس آ رہا تھا۔ آسمان بادلوں میں ڈھکا ہونے کی وجہ سے رات کا سا سماں تھا۔ یعنی اپنا کھیل کھیلنے کے لیے قدرت نے اسے از خود ہی مناسب و موزوں ماحول مہیا کر دیا تھا۔ گیٹ کنڈا لگا کر بند کیا گیا تھا۔ وہ کنڈا ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے گاڑی اندر لانے کا رسک نہیں لیا۔ اسے شکار کے خبردار ہونے کا خدشہ تھا اور یہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شکار بھاگ جائے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ آسمان سے بھوک مٹاتی سرد بوندیں ٹپاٹپ ایک تواتر سے گرنے لگیں۔ پیاسی دھرتی کا سینہ سیراب ہونے لگا۔ یہ تنہائی اور دلکش موسم سب کچھ اپنے اندر چھپا لینے والا تھا۔ اس کے اندر کا سویا حیوان پوری طاقت سے انگڑائی لے کر باہر آ چکا تھا۔

اس نے آہستگی سے سٹنگ روم کا دروازہ کھولا۔ علیزا فلور کشن پہ سر رکھے آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ اس کی شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر چڑھے تھے۔ گوری گوری بے داغ پنڈلیاں جیسے چاندنی بکھیر رہی تھیں۔ علیزا کو آہٹ کا احساس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

سجان اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے کا اعلان کر دیا۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔

"وہیں چپ چاپ بیٹھی رہو۔ حرکت مت کرنا اگر زندگی چاہتی ہو تو۔" سجان سرسراتی آواز میں بولا اور ساتھ ہی اپنی جیبوں میں موجود چیزیں نکالنے لگا۔ ان سب کو دیکھ کر مارے خوف کے علیزا کا سانس سینے میں رکنے لگا۔ اسے اپنی موت آنکھوں کے سامنے رقص کرتی نظر آ رہی تھی۔ ساتھ عزت بھی رخصت ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"رانیہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی مگر تم چھوڑ کر مت جانا۔ سنا تم نے۔ مجھے چھوڑ کر مت جانا۔" وہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ تو اس کو نہیں البتہ اس نے علیزا کا ڈوپٹہ اس کے گلے اور کندھوں سے کھینچ لیا۔ ایک طرف پکڑ کر درمیان میں سے اس نے پھاڑ لیا۔ اب دو حصے بن گئے تھے۔ علیزا خوفزدہ نگاہوں سے اس کی تمام کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اس کے جسم میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی جو وہ اپنے بچاؤ کے لیے حرکت کرتی۔ باہر بادل زوردار آواز میں گرج رہے تھے، اس شور میں کون اس کی بے آواز فریاد سنتا۔

"رانیہ منہ سے آواز نہیں نکالتی تھی۔ اس کے منہ سے تو گھٹی گھٹی چیخیں تھیں جو میرے سوا کسی کو بھی نہیں سنائی دیتی تھیں۔ اس کے تاثرات دیکھ کر مجھے بہت مزا آتا تھا۔ تسکین کا احساس ہوتا۔ اتنے روز خوامخواہ ٹینس رہا۔ کبھی سوچا ہی نہیں کہ رانیہ کا متبادل بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔" اس کے لبوں پہ شیطانی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

"پلیز سجان بھائی! میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کی بہنوں کی طرح ہوں اگر ماموں کو پتہ چل گیا تو وہ آپ کا حشر کر دیں گے۔" پہلی بار علیزا نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا تو سجان اور بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔

"میں کسی کو بھی نہیں پتہ چلنے دوں گا ہمارے ثبوت مٹا دوں گا۔" وہ دو حصوں میں پھٹا ڈوپٹہ اٹھانے کے لیے گھوما جو کمرے کے وسط میں پڑا ہوا تھا۔ علیزا کے پاس ایک ہی فیصلہ کن لمحہ تھا۔ سجان نے اپنے جوش میں کمرے کے دروازے کو لاک نہیں کیا تھا۔ علیزا بے آواز دروازے کی طرف مڑی۔ سجان وہیں رک گیا البتہ اس نے مڑ کر دیکھا نہیں۔ وہ سن سی ہو گئی سجان کے پاؤں تلے کوئی چیز آ گئی تھی۔ وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ علیزا نے تین قدم آگے بڑھائے۔ دروازے کا ہینڈل اس کی پہنچ میں تھا۔ وہ واپس مڑا علیزا کو اس نے دیکھ لیا اور بجلی کی تیزی سے حرکت میں آیا۔ علیزا نے بھی تمام تر ہمت و طاقت جمع کر کے اندھا دھند باہر کی طرف دوڑ لگا

دی۔ بارش شدت سے ہو رہی تھی۔ گیٹ بند تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ سجان غلیظ گالیاں بکتا اس کے پیچھے تھا۔ علیزا نے گیٹ کھولا۔ سجان نے اسے پکڑا اندر کی طرف کھینچا۔ اس طرح کہ وہ کھلے گیٹ سے اندر پختہ روش پہ جا گری۔ عین اسی وقت کسی گاڑی کے بریک زوردار آواز میں چرچرائے۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سارا منظر واضح ہو گیا۔ علیزا گرتے ہی ساکت ہو گئی۔ سر پہ لگنے والی چوٹ نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ خون کی ایک پتلی سی لکیر اس کے سر سے بہتے ہوئے کنپٹی تک آ گئی۔

انوشہ سب سے پہلے گاڑی سے نکلی۔ سجان حیران پریشان سا علیزا کے پاس کھڑا تھا۔ انوشہ اور وہ سب جب گاڑی سے اتر کر اندر آئے تو تب وہ چونکا۔ ایک اور گاڑی گیٹ کے باہر رکی۔ یہ سعد کی ساری فیملی تھی۔ ان کے پیچھے ہی حیدر اور روشی تھے۔ بجلی کے اچانک گل ہو جانے اور بے وقت برسنے والی موسلا دھار بارش کی وجہ سے دلہن والوں نے بہت جلد رخصتی کر دی تھی۔ اس لیے وہ سب لوٹ آئے تھے۔ اتنے عجیب حالات میں ان سب کی برسوں بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ پنکی، مہوش وغیرہ سلیمان کو ان کے ساتھ دیکھ کر چونکے مگر علیزا کو اترا چہرہ دیکھ کر ان کی حیرت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ سجان نے اس مشکل پوزیشن میں خود کو تیزی سے سنبھالا۔

"یہ بارش میں نہا رہی تھی۔ چھینٹے اڑا رہی تھی۔ میں نے منع کیا علیزا بیمار پڑ جاؤ گی مگر اس نے سنا ہی نہیں۔ پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے ابھی ابھی گری ہے۔" وہ جھوٹ بولتے ہوئے بہت مطمئن تھا۔ انوشہ کو اس وقت ملنے ملانے کا ہوش ہی کہاں تھا۔

"تیمور! کچھ کریں ناں۔ دیکھیں میری علیزا کو کیا ہو گیا ہے۔" اس کی بے چین مامتا تڑپ اٹھی۔ تیمور نے سلیمان کی طرف دیکھا صرف ایک تائیے کے لیے۔ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا اور انوشہ کی نگاہوں کے اعتماد نے اسے آسانی دے دی تھی۔ سلیمان نے فوراً آگے بڑھ کر علیزا کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پہ ڈالا۔

"قریب ہی ہاسپٹل ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔" وہ بہت سہولت سے بولا۔ اس نے کسی کو بھی کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور گاڑی نکال کر لے گیا سونی اور سنی جو گاڑی سے اترے ہی نہیں تھے۔ اس کے ساتھ تھے۔ سعد کو سب سے پہلے خیال آیا۔ وہ ہڑبڑا کر بولے۔

"چلیں سب اندر۔" انہوں نے آداب میزبانی نبھائے۔ کسی اور کو اتنا ہوش کہاں تھا۔ اندر چل کر ملنے ملانے کے مراحل طے ہوئے۔ سب بھیگے ہوئے تھے۔ روشی نے انوشہ سے

کہا کپڑے بدل لو۔ اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔ یہ ملاقات بہت اچانک تھی۔ شکوے شکایتیں ہو رہی تھیں جب عادی تیمور کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے، پاس ہی انوشہ، روشی، مہوش اور بچی سمیت ایک سوالات کے نرغے میں تھی۔ وہ سب یہی شکوہ کر رہے تھے کہ انہیں اپنے آنے کا بتایا ہی نہیں۔ انوشہ چھکی سی ہنسی ہنس دی پر یہ کہا کہ سرپرائز دینے کے چکر میں مجھے خود ہی بہت بڑا پرائز مل گیا سجان نے بڑی مہارت سے جھوٹ سچ ملا کر علیزا کے گرنے کا واقعہ بتایا اور چپکے سے کھسک گیا۔ سٹنگ روم سے اس نے تمام چیزیں غائب کر دیں۔ علیزا کا دو حصوں میں تقسیم دوپٹہ اس نے گولہ سا بنا کر الماری میں ٹھونس دیا اور بائیک اڑاتا ہوا ہاسپٹل پہنچا۔ اسے سلیمان کے آخری الفاظ اچھی طرح یاد تھے کہ میں ہاسپٹل جا رہا ہوں۔ یہ ہاسپٹل سجان کا جانا پہچانا تھا۔ ریسپشن سے اس نے علیزا نام کی مریضہ کا پوچھا اور پھر تقریباً بھاگتا ہوا اس کے کمرے تک آیا۔ جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ چوٹ اور خوف کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوئی تھی ڈاکٹر نے ضروری دوائیں دینے کے بعد علیزا کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ سلیمان بل پے منٹ کرنے گیا ہوا تھا۔ سجان کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ ضائع نہ کرے۔ علیزا اسے دوبارہ دیکھ کر سخت دھچکے کے زیر اثر آ گئی۔

”سنو علیزا! ایک بات اچھی طرح جان لو۔ جو کچھ ہوا ہے۔ اس میں میرا نام نہ آئے ورنہ سخت نقصان اٹھاؤ گی۔ میں تمہارا حال خراب کر دوں گا۔ کہنا، میں بارش میں پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے گری تھی۔“

وہ دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے چلا گیا۔ علیزا نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے سلیمان نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتی علیزا کو سب کچھ مختصراً بتا دیا تھا اور اسے یہاں لانے کا سبب بھی بیان کیا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں میں بہت سارے سوالات مچل رہے تھے۔ سنی اور سونی کی اپنی آپی سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ حیرانگی کے سمندر میں گھری علیزا نے ان پہ کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ تھوڑی دیر قبل ہونے والا سانحہ جو ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ اس کا بے ہوش ہونا، ہم کی آمد، سلیمان جیسے ایک اجنبی شخص کا اسے دوپٹے کے بغیر ہاسپٹل لانا۔ یہ سب واقعات اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وہ خاص گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کر پائی۔ اجنبیت کا احساس غالب تھا جو اس پہ حاوی تھا۔ علیزا سلیمان کے ساتھ واپس آ چکی تھی۔ وہ بے تعلق سی کھڑی تھی۔ انوشہ

نے بے خودی سے اسے خود سے لپٹالیا اور زور زور سے رونے لگی۔ اس جذباتی منظر پہ خواتین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ علیزا کے دل کی جگہ جسے کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا تھا۔ اس کے سارے خوبصورت سارے شکوے ساری شکایتیں جو اس نے بیعت کر رکھی ہوئی تھیں اسی ٹکڑے میں مقید ہو یا جم گئی تھیں۔

تیمور بہت پیار اور شفقت سے ملے۔ علیزا نے وہی بتایا جو سجان نے کہا تھا سلیمان نے اس وقت علیزا کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ تیمور کے موبائل پہ اکا بھائی کی تین کالز آ چکی تھیں وہ پریشان تھے کہ تیمور اور انوشا ابھی تک کیوں نہیں آئے ہیں۔ پنکی اور سمکی کے ساتھ روشی اور متاہل بھی کھانے کے انتظامات میں مصروف تھیں۔ ان سب کے اصرار کی وجہ سے تیمور وغیرہ مجبور ہو گئے پھر پنکی اور سمکی بھی تو انکی خاطر داری میں پیش پیش تھیں۔ سمکی نے تو سلیمان سے شکوہ بھی کیا۔

''آپ کا اور ہمارا اتنا قریبی رشتہ ہے۔ آپ نے کبھی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔''

''مجھے پتہ ہوتا تو میں ضرور بتاتا۔ مجھے خود ابھی ابھی علم ہوا ہے۔'' سلیمان نے اس کے اعتراض کو رد کر دیا۔ کھانا کھانے کے نام پہ تیمور اور انوشہ نے چند لقمے ہی لیے۔ سلیمان نے معذرت کر لی۔ انوشہ نے علیزا سے اپنی ضروری چیزیں رکھنے کو کہا تو مہوش بول پڑیں۔

''انوشہ! رہنے دو، علیزا اجنبی گھر اور اجنبی لوگوں میں کیسے رہ پائے گی یہاں پہ وہ زیادہ ٹھیک ہے۔ ہم نے پہلے بھی اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دی ہے۔ آئندہ بھی پھولوں کی طرح رکھیں گے۔'' وہ اس وقت اپنے مخصوص حاکمانہ موڈ میں تھیں جس کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ روشی چپ نہ رہ سکی۔

''اجنبی گھر اور اجنبی لوگ کیوں ہونے لگے۔ وہ علیزا کا اپنا گھر ہے۔'' مہوش نے اندر ہی اندر دانت پیسے۔

''علیزا سے بھی تو پوچھو۔ اتنی سی تھی جب تم چھوڑ کر گئی تھیں۔ اب تو ماشاء اللہ سے جوان ہو گئی ہے میری بچی۔ مجھ سے اس کی محبت مثالی ہے۔ میں نے تمہاری غیر موجودگی میں اسے ماں کا پیار دیا ہے۔'' مہوش نے انوشہ کو کچھ جتایا تو وہ شرمندگی میں نہا گئی۔ وہ تاک تاک کر نشانے لگا رہی تھیں۔

''برسوں بعد ماں بیٹی کی ملاقات ہوئی ہے۔ ادھر انوشا اور ادھر علیزا پل پل تڑپتی رہی

ہے۔ اتنے کم وقت میں دونوں کا جی نہیں بھرا ہوگا۔ جاؤں علیزا! اپنے گھر۔" روشی نے پھر دخل دیا تو مہوش نے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورا۔ سجان بھی کہہ رہا تھا۔

"علیزا ادھر ہی رہے گی" دونوں ماں بیٹا کسی منتوحہ جاگیر کی طرح اس پہ اپنا حق جتا رہے تھے۔ علیزا مایوس ہونے لگی تھی اگر روشی اس کی مدد کو نہ آتی تو جانے کیا ہوتا کیونکہ ممی کے سامنے اس کی بولتی ہمیشہ سے ہی بند ہو جاتی تھی۔ اس نے چھوٹی ممی کو تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا۔

تیمور بھی بڑے پیار بھرے اصرار سے علیزا سے گھر چلنے کو کہہ رہے تھے اور رہ گئے موبی اور سبی تو وہ اس فیصلے سے بہت خوش تھے "اب تم ہمیشہ اپنے گھر رہو گی۔" تیمور کے لہجے میں مان اور استحقاق تھا۔ انوشہ نے پرخلوص سے تیمور کو محبت سے دیا۔ اب وہ اپنے گھر جا رہے تھے۔ علیزا پچھلی سیٹ پہ موبی اور سبی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جو اس کے سر پہ لگنے والی چوٹ کی وجہ سے پریشان تھے۔ علیزا نے برسوں بعد اپنے ارد گرد گہرا تحفظ محسوس کیا۔

آغا بھائی نے کھلے دل سے علیزا کو اپنے گھر میں خوش آمدید کہا۔ اس کا لرزتا کانپتا سا دل پر اعتماد ہو گیا۔

رات گئے تک وہ سب بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ انوشہ نے کارپٹ پہ بیٹھی علیزا کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی نرم و ملائم انگلیاں علیزا کے سر میں سرسرا رہی تھیں۔ اسے بے پناہ سکون کا احساس ہو رہا تھا مگر درمیان میں اپنے برسوں کی دوری، شکوے شکایات اور مہوش کی باتوں نے علیزا کو کسی بھی قسم کا اظہار کرنے سے روکا ہوا تھا۔ آغا بھائی اور سلیمان سونے چلے گئے۔ موبی اور سبی بھی وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ تیمور نے دونوں کو اٹھا کر بستر پہ ڈالا۔

"علیزا اور انوشہ! اٹھو۔ دونوں ماں بیٹی یہیں بیٹھے بیٹھے صبح کر دو گی۔ کمرے میں آؤ علیزا کے لیے ہم نے جو چیزیں گفٹس خریدے ہیں، وہ اسے دکھائیں۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔

"کم آن علیزا آؤ اب یہ تمہارا گھر ہے۔ اس کے مالکوں میں سے ایک نام اب تمہارا بھی ہے۔" اس کی جھجک دور کرنے کے لیے تیمور مسلسل ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایک پورا سوٹ کیس علیزا کے لیے لی گئی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ تیمور علیزا کو پرانی باتیں یاد کراتے رہے۔

"تمہیں جب میں نے پہلی بار پارک میں دیکھا تو میرے دل نے کہا تھا اگر میری کوئی بیٹی ہوئی، تو وہ بالکل تم جیسی ہوگی۔ تم توتلے لہجے میں مجھے "تیموں انکل" کہتی تھیں۔ یاد ہے تمہیں۔ اگر میں ایک دن بھی نہ آتا تو تم پریشان ہو کر میرا پوچھا کرتی تھیں۔ علیزا! میں کل بھی

سا پاتی۔ اس نے انوشہ سے ماموں کے گھر گزارے کڑوے دنوں کا ذکر تک نہیں کیا تھا ویسے بھی مہوش نے کافی حد تک اپنی ریپوٹیشن اچھی ہی رکھی تھی۔ رملہ بھی ان کے باطن کو نہیں جان پائی تھی۔ سب اپنی اپنی زندگی میں مگن تھے۔ علیزا دل کا درد کس سے بیان کرتی۔ اب انوشہ اس سے کرید کرید کر سوال کرتی مگر وہ کچھ نہیں بولتی تھی۔

اس کے سر کا زخم مکمل طور پر بھر چکا تھا۔ تیمور نے نئے کالج میں اسے بی اے میں ایڈمشن دلوا دیا تھا۔ اب اسے اپنی مرضی سے وقت گزارنے کی آزادی تھی۔ اکا بھائی کی لائبریری میں اس کی پسند کی ڈھیروں کتابیں موجود تھیں۔

رملہ بھی انوشہ کے آنے کا سن کر ملنے آئی تو مہوش بھابھی کے اچھے رویے کا ذکر کیا۔ انوشہ کے دل سے تمام خفگی دور ہو گئی بلکہ الٹا وہ بھابھی کی احسان مند ہو گئی۔ مہوش نے ایک بار بھی اشارتاً نہیں جتایا تھا کہ انہوں نے اتنے سال علیزا کو کھلایا پلایا ہے۔ تعلیم دلوائی ہے۔ اس کا بیٹی کی طرح خیال رکھا ہے۔ انوشہ نے ایک دو بار سنگاپور سے ڈرافٹ بھیجا تو سعد بھائی نے منع کر دیا تھا۔ ایک بچی کتنا کھاتی ہے۔ اس کے بعد سے انوشہ خاموش ہو گئی تھی۔ البتہ ملنے جلنے والوں کے ہاتھ وہ وقتاً فوقتاً تحائف بھجواتی رہتی تھی۔

❁

مونی اور سنی سے ایک اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ مونی کا اصل نام صفیب اور سنی کا پورا نام سکندر تھا۔ مونی علیزا سے تقریباً ساڑھے پانچ سال چھوٹا تھا جبکہ سنی اس سے سات برس چھوٹا تھا۔ دونوں اسے آپی کہہ کر مخاطب کرتے تھے تو اس کے رگ و پے میں انتہائی سی خوشی دوڑ جاتی اور وہ خود کو یکدم معتبر سا محسوس کرنے لگتی۔

اس روز ویک اینڈ تھا۔ مونی اور سنی سیر کے لیے ضد کر رہے تھے تیمور، انوشہ اور علیزا کو بھی لے جانا چاہتے تھے علیزا نے معذرت کر لی۔ کل اس کا ٹیسٹ تھا جبکہ انوشہ کو قریبی مارکیٹ سے گھریلو استعمال کی چند اشیاء خریدنی تھیں۔ تیمور مونی اور سنی کو لے گئے انوشہ بھی چلی گئی تو علیزا کچھ دیر پڑھنے کے بعد سو گئی۔ اس وقت آنکھ کھلی جب فون کی گھنٹی بج رہی تھی اس نے کسلمندی سے گھڑی کی طرف دیکھا اور ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف مہوش تھیں۔ کافی دیر بات چیت ہوتی رہی۔ علیزا نے جتایا "انکل تیمور بچے اور ممانا زار گئی ہوئی ہیں۔ گھر پہ صرف تایا جان اور میں ہوں۔" جہانگیر کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ اس لیے وہ گھر پہ تھے۔

"لو ابھی تک تمہاری ماں کی لاپرواہی کی عادت ختم نہیں ہوئی۔ تمہیں غیر مرد کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر نکل گئی زمانہ بہت خراب ہے منہ بولے رشتوں کا کیا اعتبار! اکیلی جوان لڑکی کو دیکھ کر نیت خراب ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ اب تو نوشہ کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔"

مہوش رفتہ رفتہ اپنی پرانی روٹین پہ واپس آرہی تھیں جن میں سرفہرست علیزا کی برین واشنگ تھی۔ علیزا نے فون بند کیا تو اندیشوں کے ناگ اسے ڈسنے لگے۔ وہ کمرا بند کر کے بیٹھ گئی۔ مہوش نے کہا تھا۔

"اگر نوشہ سے جوان بیٹی کی حفاظت نہیں ہوتی تو وہ دوبارہ میرے پاس بھجوا دے۔ اسے تو اپنے شوہر اور جیٹھ کے چونچلوں سے ہی فرصت نہیں ہے۔ یتیم بچی کو کہاں دیکھے گی۔"

آخری جملے پہ مہوش کا لہجہ اتنا دردناک ہوگیا تھا کہ علیزا کو خود بھی رونا آنے لگا۔ ممی کی تمام باتوں پہ وہ شد چاٹتے ہوئے بھی ایمان لے آتی تھی۔ یہی تو مہوش کا کمال تھا۔ چرب زبانی اور جھوٹی ہمدردی کے بولوں سے اچھے اچھوں کو رام کر لیتی تھیں۔ یہ تو پھر کچے ذہن کی علیزا تھی جدھر ہانکو مڑ جاتی۔ پھر بچپن سے ہی وہ ممی کے زیر اثر رہی تھی۔

❁

سجان مہوش کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ وہ اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ ایک دم وہ چونک کر اٹھ بیٹھا جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔

"مما! را نہیں آئی ناں۔ آپ علیزا کو لے آئیں، وہ انکار نہیں کرے گی۔ اسے اس گھر سے جانے نہیں دینا ہے۔" وہ عجیب بہکا تہ ضدی انداز میں بولا تو مہوش کے لبوں پہ پراسرار سی مسکراہٹ آگئی۔

"لاؤں گی ضرور لاؤں گی۔ جن مہرسائیں تو نہیں ملے۔ پیر کامل شاہ مل گئے ہیں۔ میں جلد سجان کے پاس جاؤں گی۔ پہلے گئی تھی تو انہوں نے کہا کہ جس جگہ لڑکی رہتی ہے۔ اس گھر میں اگر جامن کا درخت ہے تو اس کے تنے سے لگے سات پتے لاؤں۔ اب اتفاق سے انوشہ کے گھر جامن کا درخت موجود ہے۔ میں وہ پتے لا کر پیر صاحب کو دوں گی ایسا عمل کریں گے کہ علیزا کچے دھاگے سے بندھ کر آئے گی۔ آخر اسی گھر میں پلی بڑھی ہے۔ ہمارے ٹکڑوں پہ پرورش پائی ہے اور وہ انوشہ عزت سے علیزا کو لے کر چلتی بنی ہے۔ پہلا حق تو ہمارا ہے۔ دیکھتی ہوں کب تک ان منہ بولے رشتے داروں کے گھر رہے گی۔ آنا ہمیں پڑے گا۔ جانور اپنے

مالک کے گھر کھونٹے سے بندھا ہی اچھا لگتا ہے۔ اب تم دیکھتے جاؤ۔ میں کرتی کیا ہوں۔" وہ اسے بہلاتے ہوئے بولیں تو سجان کی خوشی دوچند ہو گئی۔ مہوش جس کی کمزوری بھانپ گئی تھیں۔ کمزوری کی ڈوری ان کے ہاتھ میں تھی وہ جب چاہتیں حوالہ دے کر جذباتی بلیک میلنگ تو کر ہی سکتی تھیں۔

موٹی اور رنی نے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا۔ انوشہ کی طرف سے کھیلنے کی اجازت مل گئی تھی۔ انہوں نے بے فکری سے شمسی علیزا کو بھی پکار لیا وہ دم دم کی باڑ پھلانگ کر اس کے پاس آ گئی۔

"آپی! آئیں کچھ کھیلتے ہیں۔" شمسی بولا۔

"میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"آپی پلیز۔" وہ ٹھنک کر بولا تو علیزا کو اس کے معصوم چہرے پر ترس آ گیا۔

"آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔" شمسی سوچ کر بولا تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اس کی فرمائش رد نہ کر سکی اور دوپٹہ آنکھوں پہ باندھ کر ستون کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

"ایک دو تین......" وہ گنتی دہرانے لگی۔ موٹی اور رنی دونوں چھپ گئے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹولتی کتنی دیر انہیں پکڑنے کی سعی کرتی رہی۔ وہ ہر بار پھرتی سے اسے ناکام بنا دیتے۔ وہ جھنجھلا کر کھیل ختم کرنے والی تھی جب کسی کا بازو پکڑ کر اس نے "میں جیت گئی" کا نعرہ مارا اور آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ مارے شرمندگی کے اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ جس کا بازو اس نے مضبوطی سے پکڑا تھا وہ موٹی اور رنی نہیں سلیمان تھا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے اس کا بازو چھوڑا اور بھاگتی ہوئی اندر روپوش ہو گئی۔ پیچھے سے موٹی اور رنی کی دبی دبی ہنسی ابھر رہی تھی۔ وہ جدید دور کے بچے تھے۔ بے باک اور نڈر۔ دیر تک آپی کی خفت اور حماقت یاد کر کے ہنستے رہے۔ ادھر وہ شرمندہ ہوتی رہی کہ سلیمان کیا سوچتا ہو گا۔

اپنی دونوں کزنز سے وہ خاصی الگ اور مختلف سی تھی۔ وہ پراعتماد تھیں۔ بحث میں ہر کسی سے بڑھ کر دو بدو۔ کالج ویسے میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا لگتا ہی نہیں تھا علیزا نے ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں پرورش پائی ہے۔ ان کے نڈر پراعتماد انداز نے اسے متاثر کیا تھا۔ ایسی بولڈ لڑکیاں اس نے اپنے حلقہ احباب میں کم ہی دیکھی تھیں۔ علیزا اس سے بالکل الگ

تھی۔ اس نے ڈرے سہمے خوفزدہ اعتماد و تحفظ سے محروم ماحول میں پرورش پائی تھی جس کی واضح جھلک اس کی شخصیت میں نظر آتی تھی۔ مہوش کی دو رخی اور نمائشی پالیسی نے اس میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ شکل سے ہی ہونق اور احساس کمتری کا شکار نظر آتی تھی۔ یہ سب عدم تحفظ کے احساس کے کرشمے تھے جب سے وہ یہاں آئی تھی سب کے مثبت اور پر خلوص رویے اس کی ٹوٹی پھوٹی شخصیت کو سنوارنے میں بڑے معاون ثابت ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ نامحسوس انداز میں اس کے اندر تبدیلی رونما ہو رہی تھی جس کا اسے خود سے بھی ادراک نہیں تھا۔

اس روز سلیمان نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ انتہائی توجہ سے تو وہ اسے اضافی نمبر دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ چچی اور مسکی سے وہ فروا کے ذریعے متعارف ہوا تھا پھر ان کے اصرار پر وہ ان کے گھر بھی گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ انوشہ چچی اپنی جس بیٹی کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتی ہیں وہ یہی علیزا ہو گی۔ وہ محسوس کر رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا کہ وہ چچی سے کھنچی کھنچی سی رہتی ہے وہ اس سے ہمدردی رکھتا تھا اس لیے بعض اوقات اس کا رویہ سلیمان کو بہت گراں گزرتا تھا مگر ماں بیٹی کے معاملے میں وہ بول نہیں سکتا تھا۔ علیزا کا رویہ باقی سب کے ساتھ ٹھیک تھا ہنستی بولتی خوش اخلاقی سے پیش آتی۔ انوشہ کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اس کی نگاہوں کے سامنے تو تھی۔ علیزا کو اس سے جو بھی شکوے شکایتیں تھیں وہ انہیں کبھی بھی نوک زباں پہ نہیں لائی تھی اگر وہ کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکال لیتی تو انوشہ کا احساس جرم بھی کم ہو جاتا۔

❁

''سلیمان! جاتے ہوئے علیزا کو کالج ڈراپ کرتے جانا تمہارا آفس بھی تو ادھر راستے میں ہی پڑتا ہے۔'' انوشہ دروازے پہ کھڑی اسے امید افزا نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ یونیفارم پہن کر جوتوں کے تسمے باندھ رہا تھا۔ انہیں سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا تو وہ علیزا کو بتانے چلی گئی۔ ویسے تو ہر روز اسے تیمور ڈراپ کرتے اور واپسی میں ڈرائیور لے آتا تھا مگر تیمور پرسوں سے فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ ڈرائیور بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس لیے انوشہ نے سلیمان سے کہا۔ علیزا بیگ اور فائل اٹھائے بالکل تیار تھی۔ سلیمان گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ وہ چادر سنبھال کر انوشہ کو رکھی سے انداز میں خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور بیگ سے کتاب نکال کر سامنے رکھ کر پڑھنے لگی۔ کل جلدی جلدی یاد کیا تھا آج سب بھولا ہوا تھا ویسے بھی ٹیسٹ تھا سو اس کے بڑبڑانے کی آواز آ رہی تھی سلیمان نے ویو مرر سے اس کی گود میں دھری کھلی کتاب اور جلتے

لبوں کو دیکھا۔

"چلتی گاڑی میں مطالعہ کرنا آنکھوں کے لیے کوئی سودمند نہیں ہے۔ آپ کے پاس گھر میں اتنا وقت ہوتا ہے۔ وہاں پڑھا کریں اب کیا نزدیک پلے پڑے گا۔" وہ لطیف سے انداز میں اس پر چوٹ کر گیا تو علیزا کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ اسے سلیمان کا یوں جتانا اچھا نہیں لگا جیسے وہ اسے نالائق سمجھ رہا ہو۔ کتاب اس کی گود میں ہی رکھی رہی۔ اس نے دوبارہ نہیں کھولی۔ سلیمان نے کالج گیٹ کے سامنے اسے اتارا۔ گاڑی دوبارہ ریورس کی اور چند منٹ میں ہی تھانے پہنچ گیا۔ اس مقامی تھانے کا وہ انچارج تھا۔ اس کے ماتحتوں نے اسے دیکھتے ہی سیلوٹ مارا وہ سیدھا کمرے میں آگیا جہاں ڈھیروں شکایتیں اس کی منتظر تھیں۔ واپسی میں پھر اسے علیزا کو پک کرنا پڑا۔

❀

انوشہ پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ ابا بھائی نے بات ہی ایسی کی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے ایسا کسی غم یا دکھ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس کی یہ حالت خوشی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ابا بھائی نے سلیمان کے لیے علیزا کا ہاتھ مانگا تھا۔

"آپ نے سلیمان سے پوچھا ہے؟" وہ ڈوپٹے سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

"سلیمان میرا بہت سعادت مند اور فرمانبردار بیٹا ہے۔ میرے کسی فیصلے سے وہ انکار نہیں کرسکتا پھر بھی تمہاری تسلی کے لیے میں پوچھ لوں گا۔" وہ اسے شفقت سے دیکھتے ہوئے حوصلہ آمیز انداز میں مسکرائے تو انوشہ کا سیروں خون بڑھ گیا۔ علیزا کے مقدر کا ستارا تو تابندہ درخشندہ ہوگا۔ اس کا اندازا اسے آج سے پہلے قطعی نہیں تھا پھر سب سے بڑی بات اب علیزا ہمیشہ اس کے پاس رہے گی۔ اسے اپنی مسرت وشادمانی چھپانی دشوار ہو رہی تھی۔

سلیمان رات سونے سے پہلے جہانگیر کو دیکھنے آیا کہ سو چکے ہیں یا نہیں۔ وہ سونے سے پہلے ایک دوبار ان کے کمرے کا چکر ضرور لگاتا تھا شاید انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو۔ وہ جاگ رہے تھے اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔

"آؤ سلیمان۔"

"آج کیا خاص بات ہے جو ابھی تک جاگ رہے ہیں۔" وہ کونے میں پڑی کرسی

اٹھا کر بیڈ کے پاس رکھ کر بیٹھ گیا۔

''زحمت نہ ہو تو کھڑکی بند کر دو۔ ٹھنڈی ہوا کمرے میں آ رہی ہے۔ میں بوڑھا اب برداشت نہیں کر سکتا'' اس نے حکم کی تعمیل کی۔ پردے برابر کر کے کھڑکی بند کر کے دوبارہ ان کے پاس آ بیٹھا۔ وہ ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے پھر کوئی دیر بعد وہ گویا ہوئے۔

''سلیمان! اذری کے مرنے کے بعد میں نے تمہیں اور رمشہ کو ماں بن کر پالا۔ اوپر والے کا شکر ہے کہ تم دونوں ہی بہت سعادت مند اور نیک ہو۔ میری بھی یہ خوش قسمتی ہے جو مجھے ایسی فرمانبردار اولاد ملی ہے ورنہ آج کے دور میں تو ہر دوسرا شخص اولاد کی نالائقی کا رونا روتا نظر آتا ہے۔ تم نے مجھے کسی مقام پہ بھی مایوس نہیں کیا ہے۔ رمشہ اپنے گھر میں خوشحال اور مطمئن ہے۔ اس کے لیے میری دعاؤں سے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔ مجھے امید ہے تم بھی مجھے مایوس نہیں کرو گے والدین جو فیصلہ کرتے ہیں۔ اولاد کی بہتری کے لیے ہی کرتے ہیں۔'' سلیمان ان کی طولانی تمہید سے چوکنا ہو گیا۔

میں نے علیزا کو تمہارے لیے پسند کیا ہے'' انہوں نے بم بلاسٹ کر ہی دیا۔

''میری برسوں کی تجربہ کار نگاہیں کہتی ہیں کہ وہ بہت اچھی بیوی بیٹی اور بہو ثابت ہوگی ورنہ لڑکیاں تو اور بھی بہت سی تھیں مگر میں نے تمہاری آئندہ زندگی کو پرسکون بنانے کی خاطر علیزا کا انتخاب کیا ہے اس میں ہم سب کی بھلائی ہے کیونکہ وہ بہت بے لوث اور محبت کرنے والی لڑکی ہے بالکل اپنی ماں کی طرح۔'' وہ طمانیت سے بولے تو سلیمان دل ہی دل میں ان کے اطمینان سے خائف سا ہو گیا۔

''بالکل انگلیوں کی گائے ہے۔ ذرا بھی اعتماد نہیں ہے۔'' وہ دل میں بولا۔ مگر لبوں پہ قفل لگائے رکھا۔

''میں سوچوں گا۔''

''سوچنا نہیں غور کرنا ہے اور پھر فیصلہ کرنا ہے اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے میں تم پہ دباؤ تو ڈال سکتا ہوں ناں۔ اتنا حق ہے مجھے اگر میری پسند کا فیصلہ نہ ہوا تو مجھے قدرتی طور پر دکھ ہوگا۔ مگر تمہارے لیے یہ بھی منظور ہے۔'' آخر میں ان کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ انہوں نے خود کو تسبیح میں مشغول کر لیا جس کا مطلب تھا ''اب تم جا سکتے ہو۔'' وہ سر جھکائے ہوئے اٹھا۔

بجائے کچن میں آ گیا۔ الیکٹرک کیتل میں اپنے لیے چائے بنائی اور کنگ سائز مگ میں بھر کر وہیں بیٹھ کر پینے لگا۔

"ساری زندگی انہوں نے ہمارے آرام و آسائش کی تگ و دو میں گزاری ہے کیا ہے اگر میں بھی انہیں ایک خوشی دے دوں۔" چائے کا مگ رکھ کر وہ نیچے آیا صرف برآمدے کی لائٹ جل رہی تھی اس کا مطلب تھا سب سو رہے ہیں۔ وہ واپس آ گیا۔

سلیمان نے جہانگیر کو فی الحال کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر وہ امید تھے اس لیے انوشہ اور تیمور کے ساتھ مل کر اس سلسلے میں ضروری مسائل پہ تبادلہ خیال کرتے۔ انوشہ نے فی الحال اس بات کی بھنک علیزا کیساتھ ساتھ کسی اور کو بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ جہانگیر نے سلیمان کی مسلسل خاموشی کو اس کی رضا مندی تصور کیا اور منگنی کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ وہ خود انوشہ کے ساتھ طبیعت کی خرابی کے باوجود بازار گئے۔ علیزا کے لیے کپڑے اور انگوٹھی پسند کی۔ سوٹ انہوں نے آرڈر پہ تیار کرایا۔ ڈائمنڈ کی انگوٹھی پہلے لے آئے۔ انوشہ نے تیمور کے ساتھ جا کر سلیمان کے لیے ضروری چیزیں خریدیں۔ اب کچھ دن بعد منگنی کے کارڈز چھپ کر آ جانے تھے۔ انوشہ شام میں سعد اور حمید بھائی کے ہاں جا کر انہیں بھی اپنے اس فیصلے سے مطلع کرنے والی تھی۔ تیمور اور انوشہ شام کی چائے پہ انکے ہاں پہنچے۔ حمید گھر پر موجود نہیں تھے۔ باقی سب تھے۔ مہوش، سعد اور بچی بڑی خوشی سے ملے سجان اور سمکی گھر پہ نہیں تھے۔ چائے بڑے پر تکلف ماحول میں پی گئی۔

"انوشہ! علیزا کو بھی لے آتیں بچی سمکی کے ساتھ سجان بھی اسے بڑا یاد کرتا ہے" انہوں نے سجان پہ خاصا زور دے کر کہا۔ "بچپن سے مینیں پلی بڑھی ہے ہم تو اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ سجان تو بہت اداس ہے کہتا ہے مما علیزا کو لے آئیں ناں۔" انہوں نے کسی بچے کی طرح سجان کا دوبارہ ذکر کیا۔ وہ دوسری بار بڑے خاص انداز میں سجان کا حوالہ دے رہی تھیں۔ تیمور تو الجھ سے گئے۔ شروع سے ہی مہوش انہیں خود غرض سفاک اور دوغلی فطرت کی مالک لگی تھیں۔ اس وجہ سے وہ انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر سجان عادات و اطوار بھی بہت عجیب سے تھے۔

"رانیہ والے معاملے کا کیا ہوا۔ کچھ بہتری کی امید ہوئی یا نہیں۔" تیمور نے نامحسوس انداز میں موضوع بدل دیا۔ انہیں اور انوشہ کو رانیہ والی کہانی کا علم نہیں تھا۔ مہوش نے اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ رانیہ ہی کو قصور وار ٹھہراتیں۔ سجان میں تو کوئی برائی ہی نہیں تھی گویا۔

"میں نے سجان سے کہا ہے کہ طلاق دے ہی ڈالو اس بدچلن عورت کو۔ میں اپنوں میں کوئی لڑکی دیکھوں گی ایسی لڑکی جو دیکھی بھالی ہو۔" مہوش بولیں۔ سعد اس تمام عرصے میں خاموش رہے۔ مناہل اور روشی بھی چپ تھیں صرف وہی بول رہی تھیں۔

"یہ تو اچھی بات ہے بھابھی! اپنوں سے بڑھ کر بھلا کون ہو سکتا ہے اس لیے میں نے بھی اکا بھائی کو علیزا کے رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے بس کچھ روز پہلے ہی یہ فیصلہ ہوا ہے میں نے سوچا آپ سے بھی مشورہ کر لیا جائے کیوں' سعد بھائی! آپ کا کیا خیال ہے ویسے سلیمان ہر لحاظ سے علیزا کے لیے موزوں ہے۔" مہوش اور پنکی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پنکی تو اسی وقت اٹھ کر چلی گئی۔ البتہ روشی اور مناہل کے چہرے پہ اطمینان موجود رہا۔

"یہ تو اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔" سعد واقعی بہت خوش ہوئے روشی نے بھی اس کی تائید کی۔ مہوش تو جل کر راکھ ہو گئیں۔

"ایسا مت کرنا۔ ابھی علیزا کی عمر ہی کیا ہے۔ پڑھنے دو اسے۔ کم از کم تعلیم حاصل کر کے اپنے پیروں پہ تو کھڑی ہو سکے گی۔ شادی کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ اس قصے کو فی الحال یہیں ختم کر دو۔ مونی اور پنکی بھی ابھی پڑھ رہی ہیں۔ کون سا علیزا کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ ابھی اس کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں ہو سکتا ہے سلیمان سے بھی اچھا رشتہ اس کے لیے مل جائے۔" مہوش کی ان باتوں پہ تیمور کو بہت غصہ آیا تھا۔ سعد جیسے شوہر پہ بھی کہ انہوں نے تو جیسے کچھ نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ مہوش کی لن ترانیاں سن کر وہ بمشکل خود پہ ضبط کیے ہوئے تھے۔

"بھابھی! میں جانتی ہوں۔ علیزا جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائے اچھا ہے پڑھائی کا کیا ہے پڑھتی رہے گی ویسے بھی کون سا ہم نے اس سے نوکری کروانی ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں خوش رہے گی۔" انوشہ دبے دبے سے لہجے میں بولی تو مہوش اور بھی شیر ہو گئیں۔

"منہ بولے رشتوں یا سوتیلے رشتوں کا کیا اعتبار۔ بھلا کوئی کب تک پرائی اولاد سے چاہ جتا سکتا ہے یا اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے۔ اب علیزا کی مثال لے لو اتنے برس ہمارے سر پہ رہی مگر ہم نے احسان نہیں جتایا۔ دیکھا جائے تو علیزا پہ پہلا حق ہمارا بنتا ہے۔" ان کی تنگ دلی کھل کر سامنے آ گئی انہوں نے براہ راست تیمور پہ چوٹ کی تو وہ تلملا گئے۔ بہرحال مہوش نے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔ تیمور اس کے فوراً بعد معذرت کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو انوشہ کو

بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔ تیمور نے بمشکل اپنا غصہ پیا تھا۔

مہوش غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔ یہی حال چنکی کا تھا بلکہ رو رو کر اس کی تو آنکھیں سوج گئی تھیں علیزا نے اسے کیسی گہری چوٹ لگائی تھی اگر وہ بیچ میں نہ آتی تو شاید چنکی اسے مہوش کو منانے میں کامیاب ہو ہی جاتی۔ خیر یہ تو اس کے اپنے خیالات تھے۔ ادھر مہوش بیگم نے انوشا اور تیمور کے سامنے بڑے فخر سے کہا تھا کہ میں نے چنکی اور منکی کے لیے کئی بہت سے اچھے رشتوں کو منع کر دیا ہے۔ درحقیقت وہ ان کے لیے بہت پریشان تھیں۔ لوگ آتے۔ مہوش کی بڑ بولی زبان اور چنکی منکی کے بے باک انداز دیکھ کر دوبارہ نہ لوٹتے۔ انہیں گھر بسانے والی لڑکی چاہیے تھی شمع محفل نہیں بلکہ ان دونوں بہنوں کے خیالات بہت بلند تھے۔ منکی کلاسیکی رقص کے میدان میں دھوم کرنا چاہتی تھی جبکہ چنکی چاہتی تھی ماڈلنگ کی دنیا میں اس کا شہرہ ہو۔ لڑکوں کے ساتھ ان کی دوستیاں تھیں شریف گھرانوں والے تو توبہ کرتے تھے کیونکہ دونوں بہنیں مہوش کی چھوٹ اور سعد کی لاپروائی کے باعث بہت آزاد خیال ہو گئی تھیں۔

اب علیزا کو بیٹھے بٹھائے ایسا اچھا رشتہ مل گیا تھا تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ گئے تھے۔ ان کے خیال میں وہ اس قابل نہیں تھی۔ بھلا کہاں چنکی اور منکی جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اپنی کیفیں سے بہرہ ور زمانے کے ساتھ چلنے والی اور کہاں علیزا جیسی دبو گھر کی بدھو لڑکی۔ انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ علیزا کی شخصیت کہیں بھی نمایاں نہ ہونے پائے۔ دیکھنے والوں کو وہ کسی پہلو سے بھی قابل توجہ نہ لگے۔ یہ تو الٹ ہی ہو گیا تھا یہاں سے نکلتے ہی اس کی تو قسمت ہی بدل گئی تھی۔

"میں ان ماں بیٹی کو ہرگز نہیں جیتنے دوں گی پہلے شمع اور اب یہ ہنگی شکست کھانے والی ہرگز نہیں۔ علیزا کو اس کا پسندیدہ کھلونا لے کر ضرور دوں گی۔ میں پیر صاحب کے پاس جاؤں گی سب مسئلے چٹکی بجاتے ہی ختم۔" مہوش کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

❁

"سلیمان بیٹے کا رڈ پر انوائیٹڈ بھائیوں کے نام لکھ دو۔ کل تک سب کارڈ دینے ہیں۔ ذرا کم ہے" جہانگیر نے کارڈز کے بنڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشورہ دیا تو وہ سر کو اثبات میں ہلا کر رہ گیا۔ وہ پیچھے آیا تو علیزا امی اور موتی کے ساتھ ٹی وی کے آگے براجمان تھی۔ وہ دونوں بھائی اسے دیکھ کر مسکرانے لگے ہی تھے کہ منی نے موتی کو کہنی ماری اور سلیمان کے سامنے پہنچ گئی جب

ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا۔ علیزا ٹی وی میں گمن تھی۔

''سنی! جاؤ ایک پین لے آؤ۔'' سلیمان نے اس کا بازو پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ وہ پین لا کر آ گیا اور اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ سلیمان علیزا کی طرف متوجہ ہوا۔

''زحمت نہ ہو تو اس فہرست پہ لکھے نام ذرا خوشخط انداز میں ان کارڈز پہ لکھ دیں۔ سلیمان نے دونوں چیزیں اس کی طرف بڑھائیں۔ تو اس نے لے لیں۔ پہلے کارڈ کا جائزہ لیا اور اس کا ڈیزائن دیکھا۔ ہلکے سبز اور سلور کلر کے امتزاج سے بنا کارڈ بہت اچھا لگ رہا تھا جلد ہی علیزا نے اندر سے کھولا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مسلا غور سے دیکھا دوبارہ پڑھا۔ یہ تو اس کا اور سلیمان کا نام لکھا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے۔ میرا اور آپ کا نام۔'' علیزا کی سمجھ میں یہ گورکھ دھندا نہیں آیا تو اس نے مطلب نگاہوں سے سلیمان کی طرف دیکھا۔

''شاید غلطی سے چھپ گئے ہیں یا کسی اور کے ہیں۔''

وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ سلیمان نے لکھنا موقوف کر کے اسے دیکھا۔ اس کے تاثرات میں اداکاری کا شائبہ تک نہ تھا ''یہ کس کی منگنی کے کارڈ ہیں؟'' اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ بوکھلا گئی اور سوال جڑ دیا۔

''یہ علیزا نوید اور سلیمان جہانگیر کی منگنی کے کارڈز ہیں۔ دعوت نامے ہیں جو مورخہ تیس دسمبر بروز جمعرات کو ہونا قرار پائی ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے بولا تو علیزا کو وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ وہ کمرے میں آ گئی۔

''میری اور سلیمان کی منگنی مجھے کسی نے بتایا تک نہیں اوہ خدا یہ سب کیا ہے۔'' وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔ سلیمان بغیر کسی لحاظ کے اس کے پیچھے آ گیا۔

''لکھ لکھ کر میرے تو ہاتھ ہی درد کرنے لگے ہیں اب آپ لکھیں۔'' سلیمان نے دعوتی کارڈز اس کے قریب صوفے پہ ڈال دیے وہ نروس ہونے لگی۔ پتہ نہیں مما کہاں تھیں۔ سلیمان بھی وہیں بیٹھ گیا اور اسے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھ کر دوبارہ ڈانٹ تو مجبور ہو کر اس نے پین کی کیپ کھولی ڈرتے ڈرتے جھجک کر پہلے کارڈ پہ سید فراست حسین کا نام لکھا۔ ہاتھ کانپنے کی وجہ سے الفاظ ٹیڑھے میڑھے سے ہو گئے۔

"آپ شاید بی اے آنرز کی اسٹوڈنٹ ہیں مگر لکھائی مونٹیسوری پریپ کے بچوں والی ہے۔" وہ اس کے لکھے نام کا بغور معائنہ کر رہا تھا علیزا شرمندہ سی ہو گئی اور انگلیاں چٹخانے لگی۔
سلیمان کو اس کی گھبراہٹ پہ ہنسی آ گئی تو وہ اور بھی پریشان سی ہو گئی۔

تیمور نے منگنی سے فقط ایک روز پہلے اس کی رائے طلب کی تو وہ زمین کو گھورنے لگی۔
اس نے کبھی اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی اس کی منگنی یا شادی بھی ہو گی جہاں ہر قدم آبلہ پائی کے خوف سے ڈر ڈر کر اٹھانا پڑے وہاں سے پھول کھلنے کی امید رکھنا فضول تھی کچھ ایسی ہی حالت اس وقت علیزا کی ہو رہی تھی۔ وہ قسمت کے فیصلے پہ راضی برضا تھی جو آئندہ اس کے لیے جانے کیا کچھ لے کر آنے والا تھا۔

گھر میں چہل پہل سی ہو گئی تھی تیمور کے رشتہ داروں دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی کافی زیادہ تعداد جمع ہو گئی تھی انوشہ نے صرف قریبی لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ قمرا جو سلیمان کی خالہ زاد تھی اس نے علیزا کو تیاری میں مدد دی۔ اس نے ایسا زرق برق لباس پہلی بار پہنا تھا اس لیے عجیب سا لگ رہا تھا۔ جب تایا جان نے اسے اپنے ہاتھوں انگوٹھی پہنا کر دعا دی تو اسے رونا آنے لگا۔ سلیمان نے انوشہ کی پہنائی گئی انگوٹھی اسی وقت اتار کر کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔ وہ پرسکون لگ رہا تھا یہ بات جہانگیر کے لیے طمانیت کا باعث تھی۔

منگنی کی تقریب اختتام کو پہنچی۔ مہمان گھروں کو سدھارے۔ علیزا نے سب سے پہلے کپڑے بدلے اور شکر ادا کیا سب کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں اور پوری تقریب میں مرکز نگاہ بنے رہنے پہ وہ نروس رہی تھی اب جان چھوٹی تو شکر ادا کیا۔ موٹی اور منی اسے چھیڑ رہے تھے مگر اسے برا نہیں لگا۔ دل میں ننھی ننھی امیدوں اور خوشیوں کے جگنو چمکنے لگے تھے۔ اپنے معتبر ہونے کا احساس زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ سارا دن کام میں لگے رہنے کے بعد انوشہ بہت تھک گئی تھی یہی حال باقی سب کا تھا۔ جہانگیر کو تو چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ علیزا نے شاید ان کے دل کی آواز سن لی تھی تبھی تو چائے بنا کر لے آئی تھی۔

"خوش رہو ہمیشہ۔ اس وقت چائے پینے کو بڑا دل کر رہا تھا۔" وہ مگ تھام کر ممنونیت سے بولے۔ اس نے سب کو چائے دی۔ باہر ٹرے لے جانے لگی تو انوشہ نے آواز دی۔
"جی مما!" آج ان کے لہجے میں بیگانگی کے بجائے اپنائیت تھی۔
"علیزا! اوپر سلیمان بھی ہے اسے چائے دے آؤ مجھ سے تھوڑی دیر پہلے کہہ رہا تھا

اور چائے بنائیں۔ میرے اپنے سر میں درد ہو رہا تھا۔ سستی کی وجہ سے کچن میں جا ہی نہیں پائی اب تم نے بنالی ہے تو اسے بھی دے آؤ۔" انوشہ کے حکم پہ اس نے انہیں بغور دیکھا اس کی حالت تو جانے رشتہ طے پانے کے بعد مدن والی ہوگئی۔ بہرحال وہ چھوٹی سی خوبصورت ٹرے میں چائے کی پیالی رکھ کر اوپر لے آئی۔

سلیمان لاؤنج میں آنکھوں پہ بازو رکھے نیم دراز تھا۔ کچھ سیکنڈ وہ دروازے میں کھڑی رہی۔ اندر جائے یا یہیں سے لوٹ جائے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو آہٹ پہ سلیمان نے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ چائے بھابھی کہہ رہی تھیں آپ کو دے آؤں۔" وہ بمشکل لبوں تک آیا جملہ ادا کرنے میں کامیاب ہوئی اور چائے سلیمان کے آگے رکھی۔

"مجھے دے دیں۔" وہ بولا تو علیزا نے پیالی ٹیبل سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی دوسری انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ سلیمان کے نام کی انگوٹھی۔ اس نے چائے کی پیالی لینے کے بجائے نگاہیں علیزا پہ جما دیں۔ مٹے مٹے میک اپ کے آثار منہ اچھی طرح دھونے کے باوجود بھی نمایاں تھے۔ آنکھوں میں پھیلا کاجل پلکوں کی حدود سے باہر آ رہا تھا گلابی لپ اسٹک ہلکی ہلکی سی ہونٹوں کی تراش میں تاحال باقی تھی۔ کپڑے اس نے بدل لیے تھے پھر بھی دیکھنے کی چیز لگ رہی تھی رشتہ بدلا تو احساسات بھی بدل گئے تھے۔

"بیٹھ جائیں علیزا۔" وہ نرمی سے مگر تحکم آمیز انداز پہ پریشان ہوگئی۔

"مجھے بھی بہت ضروری کام ہے بیٹھ جائیں آپ کے بغیر بھی کام ہوتے رہیں گے۔ ویسے کیا۔ کپڑے اتنی جلدی چینج کر لیے کیا پسند نہیں آئے یا کوئی اور بات تھی۔ ویسے میرے بارے میں کیا خیال ہے ہمارے بڑوں نے جو فیصلہ کیا ہے، اس پہ آپ کیا کہتی ہیں۔" وہ کتنے مشکل سوال کر رہا تھا اسے سلیمان سے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی۔

"بتائیں ناں میں آپ کو کیسا لگتا ہوں ویسے ابا جان کے تو آپ نے ڈائریکٹ دل و دماغ پہ قبضہ کر لیا ہے اتنی جلدی منگنی کا فیصلہ کیا ہے پتہ نہیں آپ سے پوچھا ہے بھی یا نہیں؟" اف تابڑ توڑ سوالات وہ تو گھبرا گئی۔

"اچھی لگ رہی تھیں ان کپڑوں میں بلکہ بہت اچھی۔" سلیمان نے اس کی مسلسل خاموشی پہ سیدھے سادے انداز میں تعریف کی تو وہ شرما گئی اور وجود پر ڈھیر حیاں چھا گئی بڑی

تیزی سے نیچے اتری۔

❂

اک اداس کمرے میں

رات کے اندھیروں میں

سوچ کے دریچوں میں

یاد کے جھروکوں میں

اک دیا سا جلتا ہے

سوچتے ہیں کس طرح

اس نے زندگانی کو

دکھ بھری کہانی کو

معتبر بنایا ہے

مختصر بنایا ہے

چاندنی کھلی کھڑکیوں سے کمرے کے اندر در آئی تھی اور ہر چیز کو روشن کر دیا تھا۔ اچھی خاصی خنکی تھی مگر اسے ٹھنڈ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جنوری کے پہلے عشرے کا چاند پوری آب و تاب سے ہر طرف اپنی جگمگاہٹیں بکھیر رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پٹ پہ بازو رکھے باہر جھانک رہی تھی۔ اس انوکھی سرمست کیفیت سے وہ پہلی بار آشنا ہوئی تھی جہاں دل عجیب سی تال پہ دھڑک رہا تھا۔

اس کا اور سلیمان کا نام کارڈ پہ اکٹھا لکھا ہوا تھا۔

"علیزے اور سلیمان۔" وہ زیر لب کھل کھلائی پھر خود ہی ڈر گئی کہ کسی نے یہ آواز سن تو نہیں لی ہے۔ اسے اپنے اضطراب سے خدشات پہ ہنسی آ گئی۔

"علیزے سلیمان۔" اس نے دوبارہ بے خودی کے عالم میں نام دہرایا اور باہر سڑک پہ نگاہیں جما دیں جہاں دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹیں نزدیک آتی نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی سفید گیٹ کے آگے آ کر رک گئی اور ہارن بجا۔ اپنے کیبن میں کرسی پہ بیٹھے بیٹھے سوتا چوکیدار ہڑبڑا کر جاگا اور پھرتی سے آ کر گیٹ کھولا۔

"اوہ! یہ تو سلیمان کی گاڑی ہے۔" وہ خوبصورت دکھی... ی تھی، پورچ میں آ کر گاڑی رکی اور سلیمان کیپ ہاتھ میں پکڑے نیچے اترا۔ ایک لمحے کے لیے اندرونی داخلی دروازے کی

طرف دیکھا اس کے ساتھ ہی تو علیزا کا کمرا تھا۔

چاندنی میں کھڑکی پہ آگے کی طرف جھکا وجود اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ فوراً پیچھے ہو گئی اور جھٹکے سے پردے برابر کر دیے۔ چاند کی کرنیں ناراض ہو کر باہر ہی رہ گئیں اور دبیز پردوں سے جھانکنے لگیں۔

"یہ اتنا لیٹ آتے ہے مجھے پہلے پتہ نہیں تھا۔ تایا جان سو چکے ہوں گے اب یہ کھانا بھی خود ہی گرم کریں گے کتنی لف لائف ہے ان کی ہر وقت بھاگ دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ چ چ۔" اسے افسوس ہوا۔

سلیمان آہستہ آہستہ زینے طے کرتا اپنے پورشن میں آیا اور آہٹ پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا تاکہ ابو کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اللہ داد کی گرفتاری کے بعد اس نے پریس کانفرنس بلوائی تھی۔ صحافیوں کو حقائق سے آگاہ کرتے ان کے تابڑ توڑ پوچھے ہوئے سوالات کا سامنا کرتے اور دوسری کاغذی کارروائیوں میں خاصا وقت صرف ہوا تھا پھر اللہ داد کی گرفتاری کے لیے جو پاپڑ بیلنے پڑے وہ الگ کہانی تھی۔ گزشتہ آٹھ دنوں سے وہ پوری نیند بھی نہیں لے سکا تھا آج تو بھوک کا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا حالانکہ صبح منہ اندھیرے چائے کی پیالی پی کر گیا تھا دوپہر میں اسنیکس لیے تھے اب ذرا بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے دروازہ آہٹ پیدا کیے بغیر کھول کر دیکھا۔ جہانگیر پرسکون نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ نیم گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد تازگی کا احساس ہوا ساری تھکن زائل ہو گئی۔ اب چائے پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ کچن میں آ گیا شلف پہ ہاٹ پاٹ دھرا ہوا تھا جس میں یقیناً اس کے لیے کھانا تھا۔ عین اسی وقت ہاتھ میں ٹرے پکڑے علیزا نمودار ہوئی سلیمان کے اوپر جانے کے بعد اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کھایا پیا ہے کیونکہ گھر سے باہر وہ کم ہی کھاتا پیتا تھا۔ وہ کچن میں آ گئی آہستہ آہستہ کم سے کم آواز پیدا کیے بغیر روٹی پکائی۔ سالن گرم کیا۔ پانی کا گلاس رکھا اور ہچکچاتے ہوئے اوپر آ گئی۔ اس نے ٹرے ٹیبل پہ رکھی۔

"یہ تو ممانے اتنی دیر پہلے رکھا تھا۔ ہاٹ پاٹ میں ہونے کے باوجود ٹھنڈا ہو چکا ہوگا میں گرم روٹی اور سالن لائی ہوں۔" اس نے سلیمان کے آگے رکھا ہاٹ پاٹ اٹھا لیا اور ساتھ اپنے عمل کی بھی وضاحت کی۔

''اس وقت اللہ سے کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔'' سلیمان کا موڈ ایک دم خوشگوار ہو گیا پل بھر میں اس کی ساری کلفت زائل ہو گئی۔ پھر وہ چھوٹی چھوٹی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا غیر اہم سی مگر علیزا کو اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''اب اگر ایک کپ چائے مل جائے تو۔'' اس نے کھانا کھانے کے بعد برتن ایک طرف کر دیے۔ چند منٹ میں گرما گرم بھاپ اڑاتی خوشبودار مہک والی چائے اس کے سامنے تھی۔

''بیٹھ جاؤ نہیں اگر نیند آ رہی ہو تو۔'' وہ چائے کے ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے بولا۔

''چائے مزیدار بناتی ہیں آپ۔'' اس نے بے ساختہ تعریف کی تو علیزا خوش ہو گئی۔

''میں اب جاؤں۔'' اس نے چائے والے برتن دھو کر اسٹینڈ میں رکھے اور سارا پھیلاوا سمیٹ دیا۔ تھکن بھی اب بے ترتیب نہیں تھی۔ سلیمان نے رسٹ واچ آنکھوں کے سامنے کی ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

''حیرت کی بات ہے آج میں بہت تھکا ہوا ہوں مگر جانے کیوں نیند دور بھاگتی محسوس ہو رہی ہے بہرحال آپ جائیں رات کافی ہو گئی ہے۔ آئیں میں آپ کو نیچے چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تو علیزا نے بھی اس کی تقلید کی اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترنے لگی۔ داخلی دروازے سے اندر آ کر اس نے پھر دیکھا سلیمان ہنوز کھڑا تھا۔

''دروازہ لاک کر لیں۔'' اس نے مشورہ دیا تو وہ دروازہ بند کرنے لگی مگر اچانک سلیمان نے درمیان میں ہاتھ پھنسا دیا۔

''علیزا تھینک یو اینڈ گڈ نائٹ۔'' وہ بے ساختہ مسکرائی تو سلیمان کو احساس ہوا کہ اس کی مسکراہٹ بھی بہت خوب صورت ہے۔ وہ مسرور سی اندر چلی آئی اور کمبل اپنے اوپر لپیٹ کر دراز ہو گئی۔ سلیمان کے ساتھ اسے اپنا تعلق بہت پائیدار لگ رہا تھا اور بہت ساری اپنائیت رگ و پے میں خون کے ساتھ گردش کرنے لگی تھی۔ سب سلیمان کے ساتھ تعلق کا اعجاز تھا۔

٭

رانیہ کے والد احمد مقبول نے وکیل کے ساتھ مل کر سبحان کو خلع کا نوٹس بھجوانے کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ انہوں نے عالیہ غوری کو رانیہ کے کیس کے لیے وکیل کیا تھا عالیہ غوری بہت قابل وکیل تھی۔

صائمہ کے ساتھ رانیہ بہت دنوں کے بعد گھر سے نکلی تھی۔ صائمہ نے ہی تو اس کی اداسی

پر مردگی دور کرنے کے لیے شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ رانیہ کی گاڑی تو سروس کے لیے آٹو سروس اسٹیشن گئی ہوئی تھی دوسری پپا لے گئے تھے۔ صائمہ نے ہی سڑک سے گزرتی ٹیکسی کو اشارہ کر کے روکا اور دونوں بیٹھ گئیں۔ گاڑی میں بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی رانیہ کو احساس ہوا جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ٹیکسی کے بالکل پیچھے سجان کی گاڑی آ رہی تھی۔ جسے وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی حالت ہو گی۔

"پلیز گاڑی تیز چلائیں۔" وہ ڈرائیور سے روہانسے لہجے میں بولی۔ ڈرائیور کوئی بھلا مانس آدمی تھا اسے اکیلی لڑکیوں پر رحم آ گیا اور اس نے سوال جواب کیے بغیر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

"صائمہ! وہ مجھے ہرگز نہیں چھوڑے گا۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ کیا کرلے گا وہ۔ ایک انسان سے اتنا خوفزدہ ہو رہی ہو۔" صائمہ اس کا خوف کی شدت سے سفید پڑتا چہرا دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گئی۔ پولیس اسٹیشن دیکھ کر ایک خیال اچانک اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے وہیں گاڑی رکوائی۔ رانیہ کے سوچنے سمجھنے سے پیشتر ہی اس نے کرایہ ادا کیا اور اس کا بازو کھینچتی کالے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اس نے مڑ کر باہر سڑک کی طرف دیکھا۔ سجان گاڑی میں بیٹھا حیرت سے ادھر دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پہ جھلاہٹ بڑی واضح تھی۔

برآمدے سے آگے بنے کمروں کی ایک طویل قطار تھی جن کے باہر خوف صورت پودوں کے گملے ترتیب سے سجے ہوئے تھے۔ صائمہ رانیہ کے ساتھ ایک کمرے میں جھپاک سے داخل ہو گئی۔ سلیمان ان دونوں کی اچانک آمد پہ کھڑا ہو گیا بلکہ وہ رانیہ کو ایک بار کی ملاقات کے باوجود بھی پہچان چکا تھا چونکی اور سمکی کی ویل میرڈ بھابھی اسے اچھی طرح یاد تھی اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے اپیل کر گئی تھی ان کے احترام میں وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔ رانیہ کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی جو وہ اپنی نندوں کے خاص لگا میں مہمان کو پہچان نہ پاتی۔ اس نے خوفزدہ اعصاب کو پرسکون کرتے ہوئے سلیمان سے سلام واحوال پوچھا۔

"کہیئے کیسے آنا ہوا؟" وہ اردلی کو چائے کا کہہ کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"پولیس اور تھانے کس لیے بنائے گئے ہیں۔ عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لیے مگر آپ کو شاید اپنے فرائض یاد نہیں ہیں ایک شخص دن رات رانیہ کو خوفناک نتائج اور قتل

کی دھمکیاں دیتا ہے اور آپ کے کانوں پہ جوں تک نہیں رینگتی۔'' صائمہ سدا کی جذباتی اور بے صبری تھی سوچے سمجھے بغیر شروع ہوگئی سلیمان کو غصہ تو بہت آیا مگر خاتون ہونے کے ناتے احتراماً کچھ نہیں کہا۔

''خاتون! آپ کی بات بجا ہے۔ پولیس کا ادارہ عوام کے جان ومال کے تحفظ کے لیے بنایا گیا مگر ہمیں الہام تو نہیں ہوتا کہ فلاح شخص کو فلاح آدمی دھمکی دے رہا ہے۔ کیا آپ نے اس سے پہلے پولیس سے پاس آکر رپورٹ کی ہے؟ سلیمان ہمیشہ کے ٹھنڈے لہجے میں بولا تو صائمہ شرمندہ ہوگئی۔

واقعی اسے کیا خبر تھی۔ وہ تو تھانہ دیکھ کر بنا سوچے سمجھے اندر آگئی تھی اور شروع ہوگئی تھی۔ رانیہ نے اس کی طرف سے سوری کی سلیمان نارمل ہوگیا۔ رانیہ نے کچھ بتایا کچھ چھپایا۔

''آپ اس واقعے کی ایف آئی آر درج کرانا چاہتی ہیں تو میں ہیڈ محرر کو بلواتا ہوں کیونکہ اتفاق سے یہ کیس ہمارے ہی تھانے کی حدود میں آتا ہے اور قابل دخل اندازی پولیس ہے۔ مجھے یقین ہے''معمولی کوشش سے ہی آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔'' سلیمان نے بتایا۔

''دراصل میں گھر والوں کی اجازت کے بغیر یہ قدم نہیں اٹھا سکتی۔ صائمہ تو ہمیشہ کی بیوقوف ہے اب ہمیں اجازت دیں۔'' وہ صائمہ کو گھورتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اس وقت تو جان نکل رہی تھی۔ یہ ہماری عورتیں ہمیشہ بزدل کی بزدل رہیں گی۔ ایک آدمی انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دیتا ہے انہیں سب پتہ بھی ہے پھر بھی فرما رہی ہیں۔ میں گھر والوں کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کرسکتا۔''

وہ بڑبڑاتی رہی۔ رانیہ اسے ٹوکنے کے بجائے خاموش ہوگئی۔ وہ دونوں گھر واپس آگئیں۔

سلیمان احمد مقبول سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور دل سے ان کی دیانت کا معترف بھی تھا رانیہ اسی انصاف پسند جج کی بیٹی تھی۔ یہ اعتراف کرنے میں وہ کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا کہ احمد مقبول اس کے آئیڈیل رہے تھے ان کی مقدمات نے خاصی شہرت پائی تھی جس میں انہوں نے مخالف فریق کی جانب سے دھمکیوں کے باوجود انصاف کا سر نیچا نہیں ہونے دیا تھا۔ اسے ان سے بہت ہمدردی تھی۔ اگر ایک بار اس واقعے کی بھنک پریس والوں کو پڑ جاتی تو پھر اسے مشہور ہونے پہ تو تر رہے تھے رانیہ ان کی حسین وجمیل نوجوان اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کے

نائلین کے لیے تو یہ سنہرا موقع تھا۔ سلیمان کو خوب اچھی طرح اندازہ تھا اس واقعے کو کون کون سے رنگ دیے جائیں گے۔

سجان ان کا سوتیلا زاد تھا یعنی قریبی رشتہ دار۔ اسی لیے سلیمان نے گھر میں کسی سے بھی ذکر نہیں کیا وہ اصولوں پہ سمجھوتے کا قائل نہیں تھا نہ اقربا پروری اسے پسند تھی اسد مقبول سے اس نے زور دے کر کہا تھا کہ اب اگر سجان ایسی ویسی حرکت کرے تو وہ اسے ضرور مطلع کریں وہ اس کا کوئی نہ کوئی حل سوچ لے گا۔ انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے اپنے ساتھ ڈنر کی دعوت دی تو وہ رد نہ کر سکا۔

جانے غوری کے آفس جاتے ہوئے رانیہ نے سلیمان کے ساتھ چلنے کی درخواست کی وہ اسے اپنی گاڑی میں لے گیا۔ پنکی فروا کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے رانیہ اور سلیمان کو ایک گاڑی میں جاتے دیکھا تو مہوش کو بتایا۔ مہوش نے نمک مرچ لگا کر دوگنی چار گنی کر کے سجان سے جڑ دیا۔

"وہ اونچی ہواؤں میں اڑنے کی کوشش ہے میں اس کے پر ہی کاٹ ڈالوں گا دل چاہتا ہے ابھی اس کے گھر جاؤں اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا ہوا لاؤں پھر پوچھوں جا کس کے ساتھ گاڑی میں جا رہی تھی۔" سجان اتنا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس وقت جاہلوں کو مات دے رہا تھا۔ پنکی بھی اسے بڑھاوا دے رہی تھی رانیہ اور سلیمان کو اکٹھے دیکھ کر اسے آگ لگ گئی تھی۔

"مما علیزا کو چند روز کے لیے بلوائیں ناں بالکل ہی بھول گئی ہے ہم کو۔" پنکی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

"بلوا لوں گی کیوں نہیں۔ بڑی مضبوط حیثیت سے اس گھر میں آئے گی پیر صاحب نے علیزا کو حکم کو غلام بنانے کے لیے جو عمل بتایا ہے اس کے لیے علیزا کا یہاں آنا ویسے بھی ضروری ہے۔" پیر صاحب کے ذکر پہ پنکی نے برا سا منہ بنایا مشکل یہ تھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ پیروں کا زمانہ نہیں ہے ذہانت اور عقل کے کمالات دکھانے کا زمانہ ہے جس کے پاس جتنی عقل اور دھوکہ بازی کے گر موجود ہیں وہ اتنا ہی بڑا پیر ہے۔ مہوش آئے روز جو بھاری بھاری رقومات نذرانوں کے نام پہ پیر صاحبان کی تجوریوں میں منتقل کرتی رہتی تھیں اس سے بھی پنکی کو سخت اختلاف تھا۔

"مجھے یہ تیمور ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے۔ میں سعد سے بات کروں گی کہ وہ جلدی علیزا

کے رشتے کی بات کریں۔ اتنے برس ہم نے اسے کھلایا پلایا ہے۔ اس کے ناز اٹھائے ہیں اور وہ اسے لے کر پھر سے اڑ گئی ہے۔'' ان کے لہجے میں زہر ہی زہر بھرا تھا۔ پھر جانے سعد کو انہوں نے کیا سکھایا پڑھایا۔ کس کس طرح سے سجان کی حالت کے واسطے دیے کہ وہ مان گئے لیکن انہوں نے مہوش کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ وہ مان تو گئے تھے خیر اگر وہ نہ بھی مانتے تو انہوں نے کرنی تو اپنی مرضی ہی تھی۔

وہ بڑے غصے سے انوشہ کہاں مٹھائی لے کر گئیں اور سجان کے لیے علیزا کا رشتہ طلب کیا۔ وہاں تیمور اور جہانگیر بھی موجود تھے۔ مہوش کی بدتمیزی کی وجہ سے گرما گرمی ہو گئی۔

''انوشہ! منگنی ہوئی ہے کوئی نکاح تو نہیں ہوا جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ پھر علیزا پہ زیادہ حق سجان کا ہے۔ اتنے عرصے ہمارے پاس رہی۔ پلی بڑھی میرا احسان ہے یہ کہہ گئی مائیں تک بچوں کو نہیں پوچھتی ہیں۔ انہیں چھوڑ کر دور دیس چلی جاتی ہیں۔ یہ بھی خوب ہے۔ ہمیں عین وقت پہ غیروں کی طرح جتایا گیا کہ جی علیزا کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ آپ آ کر منگنی میں شرکت فرمائیں۔'' مہوش نے انوشہ کی نقل اتاری۔ ساتھ ہی اس پہ چوٹ بھی کی تو وہ تلملا گئی۔ تیمور نے اس موقع پہ بے مثال قوت برداشت کا مظاہرہ کیا۔

''آپ کو یہ بات پہلے سوچنی چاہیے تھی۔ اب جب سجان کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی اور سجان کی عمروں میں خاصا فرق بھی ہے پھر اب جبکہ علیزا کی منگنی ہو چکی ہے اور شادی کا بھی سوچا جا رہا ہے یہ بات جتانی انتہائی نامناسب اور اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔'' تیمور سدا کے معذرت خواہانہ لہجے میں بولے تو مہوش کو اور بھی تاؤ آ گیا۔

''یہ سب تو سجان کی قسمت میں لکھا تھا۔ رانیہ کا اس کی زندگی میں آنا پھر یہ جھگڑے۔ سب تقدیر کے چکر ہیں۔ رہی عمر کی بات تو مرد کی عمر کون دیکھتا ہے۔ رانیہ بھی سجان سے اچھی خاصی چھوٹی تھی۔ کم از کم آٹھ نو برس کا فرق تو تھا ہی پھر بھی اس کے گھر والوں نے اعتراض نہیں کیا۔'' مہوش کی ڈھٹائی قابل دید تھی۔ تیمور اور انوشہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ جہانگیر پہلے ہی اٹھ کر جا چکے تھے۔

''سوتیلے رشتوں کا کیا اعتبار۔ علیزا کو دنیا کی سمجھ رہی کہاں ہے۔ میں پھر آؤں گی امید ہے۔ تم میری باتوں پہ غور کر کے فیصلہ میرے حق میں کرو گی کیونکہ علیزا تمہاری بیٹی ہے اس گھر میں کسی اور کو اس پہ کوئی اختیار نہیں ہے۔'' وہ اب جذباتی مار مار رہی تھیں۔ اس کے جانے کے

بعد وہ دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

تیمور خود حیران پریشان تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خود غرض اور بدفطرت خاتون نہیں دیکھی۔ اس طرح کے لوگ کسی طرح کا بھی نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کیا کرتے۔ انوشہ اس کے باوجود میں کہتا ہوں اگر تمہیں اپنی بھابھی کا فیصلہ منظور ہے تو ہماری پرواست کرو۔''

''تیمور! آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میں بھی بھابھی کو کسی حد تک جان چکی ہوتی ہیں علیزا کی جہاں منگنی ہوئی ہے شادی بھی وہیں ہو گی سلیمان سے بڑھ کر مجھے اس کے لیے کوئی اور پسند نہیں ہے۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔

''بلکہ مہوش بھابھی کے تیور دیکھتے ہوئے میں کچھ اور سوچنے پہ مجبور ہو گئی ہوں میں چاہتی ہوں جلد از جلد علیزا کی شادی کر دوں پھر بھابھی جو دل چاہے کرتی پھریں میں اکا بھائی سے آج ہی بات کروں گی مگر آپ سے ایک درخواست ہے آپ بھابھی کی کسی بات کا تذکرہ سلیمان اور علیزا سے مت کیجئے گا۔'' وہ ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی تیمور نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ جہانگیر انوشہ کی تجویز سے بہت خوش ہوئے۔

''سلیمان آئے تو اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔'' تیمور نے کہا تو انوشہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ تیمور نے سلیمان سے بات کی تو وہ بہت فکر مند نظر آنے لگا۔

''چچا جان! ان دنوں میں بہت معروف ہوں دو تین کیس ایسے ہیں جن پہ میری پیشہ ورانہ مہارت کا انحصار ہے میری پوری توجہ ان پہ مرکوز رہنی ضروری ہے میرے روز و شب آپ کے سامنے ہیں رات کو ڈھائی تین بجے بھی اگر کال آ جائے تو مجھے ڈیوٹی پہ جانا پڑتا ہے ایسی صورت میں علیزا کو وہ وقت اور توجہ نہیں مل سکے گی جس کی وہ حقدار ہے اگر آپ لوگ میری مانیں تو شادی کو کچھ عرصے کے لیے موخر کر دیں۔'' تیمور نے جہانگیر تک سلیمان کے خیالات پہنچائے کافی دیر وہ کچھ سوچتے رہے۔

''تیمور! فی الحال نکاح پہ اکتفا کر لیتے ہیں سلیمان فارغ ہو گا تو آگے کی دیکھی جائے گی تب تک علیزا بھی ہم سب کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لے گی۔'' اب سلیمان کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا اسے ابو کی تجویز سے اتفاق کرنا پڑا۔ بڑی سادگی سے یہ شرعی تقاضا بھی پورا ہو گیا۔ انوشہ نے خود کو بڑا ہلکا سا محسوس کیا۔ اب مہوش بھابھی کی کارگزاریوں کا اسے خوف نہ

تھا۔ علیزا مضبوط ہاتھوں میں تھی۔

کسی کی ذات میں جھانکا تھا سبز موسم میں
پھر اس کے بعد پھول کھلے عمر بھر کے لیے
ہزاروں بار کسی اجنبی سی منزل سے
مجھے پیام ملا ہے کسی کے لیے

بڑے عرصے بعد سلیمان کو ایسی مکمل فرصت میسر آئی تھی۔ وہ وہ صوفی اور سنی کو آئس کریم کھلانے لے گیا۔ تیمور کے ساتھ بازار جا کر ضروری چیزوں کی خریداری کی۔ واپسی پہ تیمور تازہ مچھلی لائے جو علیزا کو بہت پسند تھی۔

''فوراً سے پیشتر فرائی کرو الو ورنہ مزا نہیں رہے گا۔'' انہوں نے شاپر اس کے ہاتھ میں تھمائے اور خود سلیمان کے ساتھ اوپر چلے گئے۔ بڑے دن کے بعد اکا بھائی کے ساتھ محفل جمی تھی۔ پرانے قصے اور باتیں چھڑ گئیں۔

''سلیمان یار! علیزا سے کہو دو کپ چائے بنا دے۔''

تیمور نے سلیمان کو اٹھایا۔ علیزا مچھلی کے تکے تل تل کر پلیٹ میں بچھے ٹشو پیپر پہ رکھتی تھی۔ سلیمان کچھ دیر دروازے میں کھڑا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔

''یوں ہمارے کچن میں کب آمد ہوئی؟'' اس کے یوں پیچھے سے اچانک مخاطب کیے جانے پہ علیزا مچھلی اٹھاتی چونک پڑی۔

''تیمور بھائی کہہ رہے ہیں دو کپ چائے چاہئیں۔'' وہ مچھلی کا ٹکڑا اٹھا کر کیچپ میں ڈبو کر کھانے لگا۔

''بہت مزیدار ہیں۔ میرے لیے بھی ایسے مزے کے کھانے کب پکاؤ گی؟'' وہ اب اسے آپ جناب کے تکلف کے بجائے بڑی اپنائیت سے تم کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ اسٹول گھسیٹ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ علیزا کو اس کے معنی خیز سوالوں سے گھبراہٹ ہونے لگی اس نے ساری توجہ چائے بنانے کی طرف مرکوز کر دی۔

سلیمان کی گہری چمکدار آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''علیزا! وہ دیکھو تمہارے پاؤں میں لال بیگ۔'' اس نے شرارت سے کہا۔ علیزا کی

حلق سے زوردار چیخ نکلی۔ چمچہ سیدھا چائے کی کیتلی پر جا گرا۔ وہ الٹ کر علیزا کے پاؤں پر آ رہی۔ اوپر جہانگیر اور تیمور ہانپتے کانپتے اترے کہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ سلیمان کچن سے باہر آ گیا۔ اسے اپنی شامت یقینی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود کو ملامت کر رہا تھا۔ علیزا کے سامنے نہ جانے کیوں وہ غیر سنجیدہ ہو جاتا تھا۔

''علیزا! کسی ریسٹورنٹ میں جا کر لنچ کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' تیمور نے پوچھا۔ وہ علیزا کو واپسی میں کالج لینے گئے تھے۔

''نیکی اور پوچھ۔ میں نے تو صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اب پیٹ میں چوہوں نے ریس لگائی ہوئی ہے۔ مونی اور سنی کے لیے بھی برگر پیک کرا لیں گے۔'' وہ خوش ہو گئی تو تیمور نے گاڑی ایک مشہور ریسٹورنٹ کی طرف موڑ لی جہاں وہ اکثر وبیشتر جاتے رہتے تھے۔

کھانے کے دوران علیزا کی نگاہ سامنے والی ٹیبل کے گرد بیٹھے افراد پر پڑی۔ اس کے بالکل سامنے رانیہ تھی اور رانیہ کے سامنے جس شخص کی پشت تھی۔ وہ اسے آنکھ بند کر کے بھی شناخت کر سکتی تھی وہ سلیمان تھا اس کے ذہن میں کوئی غلط خیال تو نہیں آیا البتہ اس نے یہ ضرور سوچا رانیہ بھابی یہاں سلیمان کیساتھ کیسے؟ سلیمان نے کبھی گھر میں ذکر ہی نہیں کیا تھا ورنہ وہ حیران نہ ہوتی۔

❁

''تایا جان! میں نے آپ کے لیے بطور خاص یہ کباب بنائے ہیں۔'' اس نے آپ کے لیے بطور خاص پر زور دے کر کہا۔

''علیزا! بیٹی! تم نے کیوں خوانخواہ تکلیف کی۔'' انہوں نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

''تکلیف کیسی۔ بیٹی ہوں آپ کی۔'' اس نے محبت سے سرشار ہوتے ہوئے اپنے بازو ان کے گلے میں ڈال دیے تو وہ نہال ہو گئے۔

''میں رمشہ کو بیاہ دینے کے بعد اکیلا رہ گیا تھا مگر اللہ کو میری تنہائی پر رحم آ گیا۔ اس نے ایک اور بیٹی مجھے دے دی۔'' وہ شفقت سے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولے۔ علیزا نے سامنے بیٹھے سلیمان کو مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا تھا۔

''آؤ تم بھی میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔'' انہوں نے دعوت دی۔ آج وہ کھانا کھانے

نیچے نہیں آئے تھے۔ شدید سردی کی وجہ سے ان کی ٹانگوں میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے علیزا اوپر ہی ان کے لیے کھانا لائی تھی۔ سلیمان کھانا کھا کر آیا تھا۔ علیزا نے اسے کبابوں کی ہوا تک بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اسے خبر تھی سلیمان کو کباب بہت پسند ہیں پھر اس نے اسے نہیں پوچھا مزے کی بات انکے لیے دودھ گرم کیا۔ انہوں نے اس کے ساتھ دوا لینی تھی۔ پلیٹ سے ڈھک کر دودھ کا گلاس وہ ان کے کمرے میں رکھ آئی۔

"علیزا! بیٹی! سلیمان کے لیے بھی دودھ گرم کیا ہے یا نہیں۔"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کے لیے بھی گرم کر دو۔ سارا دن مصروف رہتا ہے۔ آنے جانے کا کوئی وقت ہی نہیں ہے۔ تمہیں زحمت تو ہو گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ تو سلیمان نے کتاب رکھ کر اسے دیکھا۔ جہانگیر نے علیزا کو شب بخیر کہا اور سلیمان کو دروازے بند کرنے کا کہہ کر اپنے بیڈروم میں سونے چلے گئے۔ سلیمان نے ٹیرس اور گیلری کا دروازہ بند کیا۔ علیزا دودھ گرم کر چکی تھی اور گلاس میں ڈال رہی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے میرے لیے تکلیف اٹھانے کی۔ میں اپنے کام خود کر سکتا ہوں۔" سلیمان کا لہجہ بلا کی اجنبیت اور روکھائی سے بھرپور تھا۔ علیزا کے حلق میں نمکین پانی کا گولہ سا اٹکنے لگا وہ وہیں سے مڑی اور تیزی سے نیچے جانے والے زینے کی طرف بھاگی۔ بمشکل تمام آنسوؤں کے پیچھے دھکیل کر وہ پہلی سیڑھی اتری۔ دوسری پہ پاؤں پھسلتے پھسلتے تیسرے زینے پہ بالآخر سلیمان نے اسے جا لیا اور اپنی طرف کھینچا۔

"بہت غصہ آتا ہے تمہیں۔ ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے۔ کتنی دیر سے میرے سامنے بیٹھ کر مجھے نظر انداز کر رہی ہو۔ تایا جان! یہ کباب میں نے بطور خاص آپ کے لیے بنائے ہیں۔ یہ لیں ناں وہ لیں ناں۔" سلیمان نے اس کی نقل اتاری۔ وہ سوں سوں کرتی رہی۔

"مجھے کیا پتہ تھا لاس بیک سے اتنا خوفزدہ ہوتی ہو بس اتنی ہی بہادری ہے ابو جان سے مجھے ڈانٹ پڑوا دی اور معذرت کا ایک لفظ تک نہیں کیا۔" علیزا کی آنکھیں اس کی ڈھٹائی پہ پھیل گئیں۔

"میں معذرت کروں اس بات کی کہ سب نے ہی مجھ سے پوچھا علیزا اب تمہارے

پاؤں میں جلن یا درد تو نہیں ہوتا۔ ایک آپ تھے منہ اٹھا کر گزر جاتے تھے۔" وہ بے ساختگی در روانی سے کہتی چلی گئی۔ سلیمان کے چہرے پہ مسکراہٹ نے بسیرا کر لیا۔

"میں معافی ضرور کروں گا مگر پہلے مجھے کباب بنا کر کھلانے کا وعدہ کرو۔"

"ٹھیک ہے فریزر میں پڑے ہوئے ہیں میں کل ہی فرائی کر دوں گی۔" وہ ایک دم راضی ہو گئی۔

"وعدہ۔ اپنے ہاتھ سے کھلاؤ گی۔" سلیمان نے اپنی چوڑی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی ایک تامل کے لیے وہ ہچکچائی اس نے الفاظ پہ دھیان نہیں دیا تھا۔

"وعدہ۔" اس نے اپنا ہاتھ سلیمان کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

"کس بات کا وعدہ۔" اس نے علیزا کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں قید کر لیا تھا۔

"یہی کہ میں کل آپ کو کباب تل دوں گی۔" وہ اپنے چہرے پہ جمی اس کی مقناطیسی نگاہوں اور محسوس ہوئی قربت سے بوکھلا گئی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اسے اپنی پرفسوں نگاہوں سے تکتا رہا۔ علیزا کو یوں لگا جیسے صدیاں گزر گئی ہیں۔ سلیمان نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس کا گلابی پسینہ آلود ہاتھ چھوڑ دیا۔

"آؤ تمہیں نیچے چھوڑ آؤں۔" اس کا لہجہ بڑا بھاری اور عجیب لگ رہا تھا۔

"میرے پاؤں میں پھر درد ہو رہا ہے۔" اسے سچ مچ بہت درد ہو رہا تھا۔

"آؤ اٹھا کر کمرے تک چھوڑ آؤں۔" سلیمان سابقہ کیفیت کے حصار سے نکل آیا اور بی بچ باز وہ اس کی طرف بڑھائے۔

"جی نہیں۔" وہ فوراً گھبرا کر نیچے اتری اور سنبھل سنبھل کر جانے لگی۔

"کل کا وعدہ یاد رکھنا۔" سلیمان نے مڑتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"اگر نہ یاد رکھوں تو......" سلیمان نے منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دھمکی دی تو علیزا نے فوراً اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

✿

موتی اور ستی مری جانے کی ضد کر رہے تھے۔ تیمور فارغ ہی نہیں تھا سلیمان نے چند روز کی چھٹی لے رکھی تھی۔ تیمور نے سلیمان سے کہا کہ موتی ستی کے ساتھ علیزا کو بھی مری

گھمائے۔ سنو فال ہو رہی تھی اس لیے دونوں بھائی بہت پرجوش ہو رہے تھے۔ موٹی اور سنی سخت سردی کے عادی نہیں تھے پر وہاں بارشوں کے بعد برف باری نے درجہ حرارت کو نقطہ انجماد سے بھی نیچے گرا دیا تھا۔ اس کا احساس اسلام آباد کی حدود سے نکلتے ہی انہیں بخوبی ہو گیا۔ طویل سڑک پہ دو رویہ درخت مناظر کے حسن کو بڑھا رہے تھے۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد وہ اپنے ٹھکانے پہ پہنچ گئے۔ چوکیدار کی بیوی کو ان کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے آتشدان میں ڈھیروں لکڑیاں سلگائی ہوئیں تھیں۔ علیزا تو آتش دان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

وہ تینوں جانے کہاں چلے گئے تھے۔ اسے بہت شدید بھوک لگ رہی تھی وہ سہ پہر کے بعد گھر سے نکلے تھے۔ اب چھ بج رہے تھے مارگلہ کی پہاڑیوں پہ رات اتر آئی تھی۔ محکمہ موسمیات والوں نے ابھی مزید برف باری کی پیش گوئی کی تھی۔ تین فٹ برف پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ اب تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ موٹی اور سنی اور سلیمان باہر سے آئے تو ان کی جیکٹس اور سر کے بالوں میں سفید ذرات چمک رہے تھے۔

''کہاں چلے گئے تھے تم لوگ۔ مجھے اتنی شدید بھوک لگ رہی ہے۔'' علیزا کچھ خفا خفا سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ان دونوں کے لیے ماسٹر بیڈ روم میں اپنے ساتھ بستر لگوایا تھا۔ اس الگ تھلگ سے گھر اور اجنبی جگہ سے اسے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ موٹی اور سنی تھکن اور علیزا کی ڈانٹ کی وجہ سے سو چکے تھے۔ زیبو اور شرافت کے کمرے کی لائٹ بھی بجھ چکی تھی۔ سلیمان نے جیکٹ پہنی جرابیں اور شوز چڑھائے۔

''میں باہر جا رہا ہوں۔'' اس نے پریشان بیٹھی علیزا کو مطلع کیا تو وہ چونک گئی۔

''آپ ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں اس ویران گھر میں۔'' وہ شاکی لہجے میں بولی۔

''تو پھر آؤ میرے ساتھ۔'' سلیمان نے اشارہ کیا۔

''کم آن علیزا! شرافت ہے ناں موٹی اور سنی سوئے ہوئے ہیں۔'' وہ اسے تذبذب میں دیکھ کر بولا۔ برآمدے سے آگے سارا راستہ برف سے ڈھک چکا تھا۔ چاند کی دودھیا روشنی میں ہر شے نے سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی پوری کائنات کا حسن جیسے اس وادی میں سمٹ آیا تھا۔

''امیزنگ۔ یوں لگتا ہے جیسے جنت خود زمین پہ اتر آئی ہے۔ میں نے اس سے پہلے اتنی خوب صورت چاندنی رات نہیں دیکھی۔ دیکھو تو تم نے کبھی چاندنی رات میں برف کی بارش کا نظارہ کیا ہے۔ کبھی اس حسن کی نزاکت کو محسوس کیا ہے جس طرح میں کر رہا ہوں۔'' علیزا خود

مبہوت ہو کر اس نظارے کو دیکھ رہی تھی۔
''آپ تو پولیس آفیسر ہیں کمال ہے' آپ کے منہ سے ایسی شاعرانہ نازک باتیں سن کر مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولی تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔
''میں اندر جا رہی ہوں مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔'' علیزا نے اپنے ٹھنڈے برف ہاتھ آپس میں رگڑے۔ سردی کی شدت سے اس کے دانت مسلسل بج رہے تھے۔ وہ اندر چلی گئی تو سلیمان بھی مڑا۔ آتشدان میں کوئلے بجھ کر راکھ بنتے جا رہے تھے۔ سونی اور سنی کے کمرے میں بجلی کا ہیٹر چل رہا تھا۔ سلیمان نے بند کر دیا کیونکہ کمرا گرم ہو چکا تھا۔
''ایک کپ چائے پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
''سلیمان نے اسے آفر کی۔ علیزا کو نیند آ رہی تھی پر سلیمان کی آفر کو وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے چائے خود بنائی۔ سلیمان اپنے کمرے میں نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ جو ٹی وی لاؤنج سے شرافت نے یہاں رکھا تھا۔ علیزا نے اس کے دروازے پہ ہلکے سے دستک دی تو وہ بڑا حیران ہوا۔
''آ جاؤ۔ آج تو حیران کر رہی ہو۔'' اس نے چائے اس کے ہاتھ سے لے لی۔
''گرم بستر میں بیٹھ کر چائے پینے کا لطف ہی کچھ اور ہے خاص طور سے سردیوں میں۔''
''یہ کیا کہ بندہ سوتے وقت چائے پی لے۔ ساری نیند کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔'' اس نے اپنی ستواں ناک سکیڑی۔
''میں تو سونے لگی ہوں۔'' وہ اٹھی۔
''آؤ ناں۔ کچھ دیر اور بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ بڑا سحر آلود سا ماحول ہو رہا ہے۔'' اس نے جاتی علیزا کو روک لیا۔ عین اسی وقت اس کے موبائل پہ بپ بجنا شروع ہو گئی۔
''السلام علیکم۔''
''وعلیکم اسلام سلیمان! اس وقت کیا کر رہے ہیں۔'' دوسری طرف رادیہ تھی۔
''رومانس جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' علیزا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو اس نے خفت سے منہ موڑ لیا۔ دوسری طرف رادیہ کے اعصاب تن گئے۔
''بھئی آئی ایم سوری۔ دراصل موسم اتنا خوب صورت ہو رہا ہے ایسے میں دل بڑی انوکھی انوکھی سی خواہشیں کرتا ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے گزشتہ جملے کی وضاحت کرتے

ہوئے بولا۔ علیزہ اچھے سے موقع غنیمت جان کر چلی گئی۔

"[illegible] تھا۔" رانیہ کے ساتھ اس کی جو ملاقاتیں ہوئی تھیں انھوں نے اسے کافی اپنائیت بخش دی تھی۔

"ہونا کیا تھا۔ ابھی ابھی چائے پی ہے رہی سہی نیند بھی اڑ گئی ہے جبکہ باقی سب نرم گرم بستروں میں محو خواب ہیں۔"

"کیا آپ کو کوئی خواب نہیں ستاتا۔" رانیہ نے لہجہ کافی محتاط رکھا تھا پھر بھی وہ اس کے سوال کو سمجھ گیا۔

"اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ خواب ستاتے۔ میں نے کھلی آنکھوں سے کبھی خواب دیکھنے کی جرأت ہی نہیں کی مگر اب دل چاہتا ہے کہ کسی کی آنکھوں سے خواب چرا لوں۔" وہ عجیب دھیمے لہجے میں بولا۔

"بہرحال آپ بتائیں۔ آپ کی نیند کیوں اڑ گئی ہے سلیمان۔"

"مری کے برف زاروں میں جب انسان میری طرح اکیلا ہو تو اس کی نیند تو اڑے گی ہی ناں۔"

"اوہ امیزنگ تو آپ مری میں ہیں۔ سنا ہے وہاں سنو فال ہو رہی ہے۔ مجھے تو یہ سب بہت فیسی نیٹ کرتا ہے۔"

"آپ کو کرتا ہے ورنہ کچھ لوگ تو مارے ڈر کے گھر اینڈر کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔" وہ ہنسا۔

"آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا اتنی رات گئے فون کرنے پر۔"

"ارے [illegible] رانیہ! کیسی غیروں جیسی بات کرتی ہیں۔" اس نے فوراً ٹوکا تو وہ خوش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد رانیہ نے فون بند کر دیا۔

"سلیمان! کیس عدالت میں چلا گیا ہے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے جانے سجان کا کیا ری ایکشن ہو۔" وہ بہت فکرمند تھی۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو میں پوچھ سکتا ہوں ایسی کیا بات ہے کہ آپ اپنے شوہر سے اتنی خوفزدہ رہتی ہیں [illegible] کیا ہے جو بھی سجان کا ذکر آتا ہے آپ کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔" رانیہ کے چہرے پر کرب و اذیت کے

آثار ابھر آئے تھے۔

"ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔" رانیہ نے اسے ٹالا۔ سلیمان کوئی بچہ تو نہیں تھا جو بھول سکتا کہ اسے بہلایا گیا ہے۔

"سلیمان! میں نے اس گھر میں جو دن بھی گزارے ہیں بہت گھٹ گھٹ کر گزارے ہیں۔ اب بھی وہ وقت یاد آنے پہ مجھے تھرتھری آ جاتی ہے سوائے علیزا کے مجھے کسی سے بھی بھلائی کی امید نہیں تھی۔ وہ سب سے مختلف تھی سجان کی خود غرض و بے حس مما اور بہنوں سے تعلق ڈنگ تھک۔" وہ بیتے دنوں میں کھو گئی تھی۔

سلیمان اس کے تبصرہ پہ خاموش رہا اور سامنے پڑی کافی کی پیالی اپنے لبوں سے لگالی۔ مقبول ہاؤس کے مکینوں کے نزدیک وہ تقریباً اب گھر کا فرد سا بن گیا تھا۔ وہ خود سب سے اپنائیت محسوس کرتا تھا۔ رانیہ کی ادھوری باتوں سے اسے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ دن بھر اس کا واسطہ بھانت بھانت کے لوگوں سے پڑتا تھا جن میں سے ہر ایک کے پاس اپنی ہی الگ کہانی ہوتی تھی۔ اس عرصے میں وہ چہرے پڑھنے کا فن کچھ کچھ جان چکا تھا۔ مگر رانیہ کا چہرا اسے کوئی پراسرار کہانی سنتا محسوس ہوتا تھا جو اس نے دل کے نہاں خانوں میں محصور کر رکھی تھی۔ جانے اس میں رانیہ کی کون سی بہتری یا مصلحت تھی جو وہ اس سے چھپا رہی تھی۔

"اگر سجان سے آپ کو کوئی ایسا دکھ ملا ہے جو آپ کے لیے نا قابل برداشت یا نا قابل بیان ہے تو میں اسے جاننے پہ اصرار نہیں کروں گا مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ مشکل میں آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گی۔ جانے کیوں آپ سے میں بہت ہمدردی محسوس کرنے لگا ہوں۔" اس نے رانیہ کے ہاتھ پہ تھپکی دی تو اس کے تن بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اسے کچھ انوکھا سا محسوس ہوا۔ سجان کے وحشت انگیز لمس نے کبھی اس کے اندر ایسی سنسنی نہیں پیدا کی تھی۔ سلیمان نے بڑی مشکل سے ہمدردی کی جگہ لفظ لگاؤ زبان تک آنے سے روکا تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ رانیہ تھی شائستہ، مہذب، تعلیم یافتہ، نرم زبان حسین لڑکی کو کون ناپسند کر سکتا تھا۔ اس نے مشکل میں سلیمان کو سہارا بنایا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں اس کے اندر کچھ نئے احساسات جگا رہی تھیں۔ وہ کبھی کبھی دل میں الجھن محسوس کرتا، جانے اسے رانیہ سے لگاؤ تھا یا صرف ہمدردی۔

"ٹھیک ہے، کبھی بھی مشکل میں میں آپ ہی کو آواز دوں گی۔" وہ جواباً تشکرانہ انداز میں بولی۔ سلیمان اٹھ کھڑا ہوا۔

''کھانا کھا کر جایئے گا۔'' وہ اصرار کر رہی تھی مگر اس نے سلیقے سے معذرت کر لی۔ رانیہ گیٹ تک اسے چھوڑنے آئی۔ اس کی گاڑی کو وہ سڑک پہ دور تک جاتا دیکھتی رہی۔

''سجان! اٹھارہ تاریخ کو عدالت میں پیشی ہے۔ تیار رہنا۔'' مہوش نے جلے بھنے انداز میں اسے ایک بار پھر یاددہانی کروائی تو وہ چیخ اٹھا۔

''کیوں بار بار یاد دلاتی ہیں مجھے۔ میرا جی چاہتا ہے میں سب کچھ تباہ کر دوں۔'' اس کے چہرے کے نقوش غصے کی زیادتی سے بگڑ کر عجیب سے ہو گئے۔ ''میں رانیہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔ قسم کھا کر کہتا ہوں میں علیزا کو بھی مار دوں گا۔'' وہ دیوانہ وار دیوار پہ مکے برسانے لگا۔ وہ ہوش و خرد سے بالکل بیگانہ لگ رہا تھا۔ مہوش کو اس سے خوف سا محسوس ہوا۔

''مما! لا دیں نا علیزا کو۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔'' وہ اسی مجنونانہ انداز میں ان کے شانے جھنجھوڑنے لگا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں علیزا کو بہو بنا کر ضرور لاؤں گی چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ تم بس ذرا صبر اور عقل سے کام لو۔'' وہ اسے سمجھانے لگیں۔ سجان کا چہرہ چمک اٹھا۔

⁂

''مّی جی! آپ یہاں۔'' علیزا چھٹی میں گیٹ سے باہر آئی تو مہوش کو دیکھ کر حیران ہوئی مگر انہوں نے اسے زیادہ حیران ہونے کا موقع نہ دیا اور ہاتھ پکڑ کر پاس پارک کی ہوئی اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہ ہیں ہیں کرتی رہ گئی اور مہوش نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''کتنے روز ہو گئے ہیں میں تو تمہیں دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ تمہاری ماں بڑی سنگدل ہے۔ ہمارے گھر جانے پہ پابندی لگا دی ہے اس لیے تو میں آج تمہارے کالج آ گئی ہوں۔ تمہاری صورت دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ آؤ سامنے والے ریسٹورنٹ میں لنچ کریں گے ساتھ تم سے باتیں بھی ہوں گی۔''

پھر کھانا کھانے کے دوران مہوش نے وہ دل دہلا دینے والے انکشافات اس پہ کیے کہ علیزا کے حلق میں نوالے اٹکنے لگے اور کھانا دو بھر ہو گیا۔ مہوش لوگوں کی پروا کیے بغیر چپکوں چپکوں رو رہی تھیں اور علیزا اسد اپنی رحمدل خود کو سنبھالتے ہوئے انہیں چپ کروا رہی تھی۔ دل میں غم و غصے کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا بظاہر وہ پرسکون تھی۔

"امی پلیز! چپ ہو جائیں۔ لوگ ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔" علیزا نے منت کی تو انہوں نے دوپٹے سے آنسو خشک کیے۔

"علیزا! تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے۔ بن باپ کی بچی کا کیا بنے گا۔ انوشہ اتنی ادبی اور سنگدل نکلے گی۔ مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا۔ لو اپنے ہی کلیجے کے ٹکڑے کو بھینٹ چڑھا دیا اور وہ سلیمان کتنی لڑکیوں کو چکر دیے ہوئے ہے۔ رانیہ بھی اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور سجان جیسے محبت کرنے والے شوہر سے آزادی مانگ رہی ہے۔ میرے بچے نے کیا کچھ نہیں کیا اس آوارہ کے لیے۔ وہ تو عذاب خداوندی سے بھی نہیں ڈرتی۔ مزے سے اس کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہے۔ انوشہ نے سراسر گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ اسے بن باپ کی بچی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے خوف نہیں آیا۔ تیمور بھی تو برابر کا شریک ہے تب ہی تو تمہیں بھائی کے آوارہ سپوت کے ساتھ نکاح جیسی زنجیر میں باندھ دیا تاکہ تمہارے باپ کی دولت پہ عیش کرے اور کرائے۔ تمہارے باپ نوید کے پاس اللہ نے فراخی رحمت کرے بہت دولت تھی۔ سب کچھ تو تمہارے لیے ہی چھوڑ گیا ہے۔ انوشہ نے بڑے عیش کیے۔ تیمور نے ان ہی پیسوں سے ایڈورٹائزمنٹ کا بزنس شروع کیا تھا اور آج لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ سلیمان نے نئی گاڑی کس کے پیسوں سے خریدی؟ مونی اور سنی کس کے بل پہ عیش کر رہے ہیں؟ انوشہ نے سب کے ساتھ مل کر اندھیر مچا رکھی ہے۔ اسے تم پہ ترس بھی نہیں آتا۔ جب تم چھوٹی سی تھیں تو میں نے انوشہ سے تمہارے اور سجان کے رشتے کی بات کی تھی۔ اس نے بڑی نخوت سے انکار کر دیا۔ اب بھی مجھ سے اور سعد سے مشورہ کیے بغیر بالا ہی بالا تمہیں اس کرپٹ پولیس آفیسر کے پلے باندھ دیا۔ تم سلیمان کے آگے کیا حیثیت رکھتی ہو۔ اتنی لڑکیاں روزانہ اس کے ہاتھوں سے گزرتی ہیں۔ تمہارا تو کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ ادھر میرا سجان رانیہ کے ہاتھوں تباہ ہو چکا ہے۔ ادھر تم جا ہی رہی ہو۔ انوشہ نے شادی کے وقت تمہیں تیمور نے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ خود انوشہ تیمور کی محبت میں اندھی ہو چکی تھی۔ شادی کے بعد تمہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے ماں بن کر تمہیں پالا ہے۔ میں نے بھی تم پہ سختی کی تاکہ تم ماں کی غیر موجودگی میں مثالی لڑکی بنو اور آج ہر شخص تمہاری تعریف کرتا ہے۔ انوشہ کو میری قربانیوں کا کوئی احساس نہیں ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر گاڑی میں زارو قطار رو رہی تھیں۔ علیزا افسردہ ہوتے ذہن کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔

"آؤ، کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔" انوشہ ...

کی شہ پہ تمہیں کھڑے کھڑے بے عزت کر کے گھر سے نکال دے گی اور خود کو تمہاری ماں کہنے سے ہی انکاری ہو جائے گی۔ میرا موبائل نمبر لکھ لو۔ کوئی بھی مشکل پریشانی یا ایسی ویسی بات ہو تو مجھے اسی وقت کال کر سکتی ہو۔ میرے گھر اور دل کے دروازے ہمیشہ سے تمہارے لیے کھلے ہیں اور کھلے رہیں گے۔" انہوں نے محبت سے اسے گلے لگایا اور الوداعی بوسہ اس کی پیشانی پہ ثبت کیا۔ وہ انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی حتی کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ انہوں نے علیزا کو ایسا بم بنا کر بھیجا تھا جو بلاسٹ ہونے کی صورت میں تباہی دکھ اور افسوس کی نشانیاں اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تلافی کی کوئی صورت ہی نہیں نظر آتی۔

داخلی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اسے انوشہ کی پریشان صورت نظر آئی تو اس کی نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ دھوکہ لالچ اور خود غرضی جیسے الفاظ اس کے ذہن میں پھرنے لگے۔

"علیزا! اتنی دیر کیوں لگا دی۔ ڈرائیور بھی خالی واپس آگیا۔ میں اب گھبرا کر سلیمان کو فون کرنے لگی تھی۔" وہ تقریباً ہانپتی کانپتی اس کے پاس آئی تو علیزا نے سرد نگاہوں سے اسے گھورا اور اپنا بازو چھڑا کر اندر بڑھ گئی۔ دروازہ لاک کرنے کے بعد وہ جی بھر کر روئی پھر بھی دل کی آگ سرد نہیں ہوئی تہس نہس کر دینے کا باغی جذبہ اس کے اندر سے لاوا بن کر پھٹ پڑنے کے لیے بیتاب تھا۔ وہ انوشہ سمیت کسی کی بھی صورت دیکھنے کی روادار نہ تھی تبھی تو انوشہ دروازہ پیٹ پیٹ کر چلی گئی۔ وہ روتی رہی۔ مغرب کی اذان ہوئے کافی وقت گزر گیا تھا جب اس نے کمرے سے باہر قدم رکھا۔ انوشہ پریشان صورت لیے سامنے برآمدے میں موتی اور سنی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بھی چپ چپ تھے۔ انوشہ اس کی طرف لپکی۔

"علیزا! بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے۔ میری بیٹی کو کسی نے کچھ کہہ دیا ہے۔" لگ رہا تھا وہ ابھی رو پڑے گی۔

"خبردار جو آپ نے مجھے بیٹی کہا۔ میں کسی کی بھی بیٹی نہیں ہوں۔ تیمور صاحب سے بھی کہہ دیجیے اب مزید ڈرامہ بازی نہیں چلے گی۔ آپ ماں نہیں ڈائن ہیں آپ اور آپ کا شوہر بے انتہا لالچی اور سنگدل ہیں۔ میرے باپ کے مال سے سب عیش کرتے رہے مگر اب اور نہیں۔ میں زیادہ دن کسی کو فائدہ نہیں اٹھانے دوں گی۔ میری آنکھیں ہی اب کھلی ہیں۔ مجھے ہوش ہی اب آیا ہے "سب نے میرے ساتھ گیم کھیلا ہے۔" اس کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے لپک رہے تھے جس نے انوشہ کے وجود کو خاکستر کر دیا تھا۔

باہر سے آتے تیمور ایک ایک لفظ سن چکے تھے۔ انوشہ سے زیادہ ان کی حالت خراب تھی۔ وہ تو لڑکھڑاتے قدموں سے علیزا کے آگے سے ہٹ گئی اس کے پیچھے تیمور بھی آ گئے۔

"انوشہ تمہیں خاموش نہیں رہنا چاہیے تھا۔" علیزا کے منہ میں جس کی زبان بول رہی ہے۔ تم بھی اسے اچھی طرح جانتی ہو اور میں بھی۔ مہوش اس حد تک گر سکتی ہیں۔ مجھے اس کی امید نہ تھی۔ علیزا کے دل و دماغ میں یہ زہر انہوں نے ہی انڈیلا ہے۔ بچپن سے ہی وہ ان کے اشاروں پہ چلتی آئی ہے۔ انوشہ! تصور کرو۔ سوچو تو علیزا تمہارے ساتھ ہم سب کو بھی غلط سمجھ رہی ہے۔ اکا بھائی سنیں گے تو انہیں سب سے زیادہ دکھ ہوگا۔" تیمور اپنی کنپٹیاں مسلتے ہوئے از حد پریشان تھے۔ موٹی اور کئی گھر کے ماحول کی وجہ سے الگ سے ہوئے تھے۔

گاڑی کے ہارن کی آواز پہ علیزا نے کھڑکی سے پردہ سرکا کر گلاس ونڈو سے جھانکا۔ سلیمان گاڑی اندر لا رہا تھا۔

"اس رانیہ کو میں کتنا شریف سمجھتی تھی۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی کہ کتنی مظلوم ہے اور وہ کیا سے کیا نکلی اور سلیمان جو بظاہر بہت باکردار اور مضبوط نظر آتا ہے۔ کتنا پست کردار کا فلرٹی شخص ہے۔ میں نے سلیمان کے حوالے سے کتنے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ میں سب خوابوں کو آنکھوں سے نوچ ڈالوں گی۔ مگر کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟"

وہ سلیمان کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہی تھی اور سسک رہی تھی۔ میں کتنی اکیلی ہوں۔ میرے ارد گرد سب اپنے ہیں مگر کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ سلیمان کو اسی طرف آتا دیکھ کر اس نے پردے برابر کر دیے۔

قرب میسر ہو تو پوچھیں درد ہوا یا درماں ہو
دل میں تو آن بسے ہو لیکن مالک ہو یا مہماں ہو
دردی آگ سے دوری بہتر قربت کا انجام ہے راکھ
آگ کا کام فروزاں ہونا راکھ ضرور پریشاں ہو
سودا عشق کا سودا ہم نے جان کے جی کو لگایا ہے!
عشق پہ صبر و سکوں کا دشمن پیدا ہو یا پنہاں ہو
عشق وہ آگ کہ جس میں تپ کر سونا کندن بنتا ہے
آگ میں تجھ کو کچھ نہیں ہو تو اس آگ میں بریاں ہو

وہ کیا کیا سوچ گئی۔ سلیمان کب کا لوٹ چکا تھا۔ وہ بھٹکی روح کی مانند دوبارہ کھڑکی میں آ کر بیٹھ گئی۔ رات کے سناٹے کو توڑتی فون نمبرز کا خیال آیا۔ وہ بیڈ پر رکھا موبائل اٹھا کر ہی کو نمبر ملانے لگی۔ دوسری طرف سے مدہوش کی غنودگی میں ڈوبی غصیلی آواز آئی تو اس نے بولے بغیر، وہاں آف کر دیا۔

"سلیمان! دو پیشیاں گزر چکی ہیں مگر ابھی تک کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔"
کمرہ عدالت سے باہر آتے ہی رانیہ نے سلیمان سے سوال کیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔
رانیہ کو ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ عدالتی کارروائیاں کتنی سست ہوتی ہیں۔ سلیمان اسے یہی سمجھا رہا تھا۔
"رانیہ! ابھی تو صرف دو پیشیاں گزری ہیں۔ اتنی جلدی کہاں فیصلہ ہو گا۔ یہاں تو سالوں گزر جاتے ہیں کیس کا فیصلہ ہوتے ہوتے۔ آپ جیسے واقعات میں فریقین عدالت سے باہر ہی کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"
"سلیمان! اچانک یہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں ایک ایسا گواہ درکار ہے جو سجان کا قریبی رشتہ دار یا دوست ہو اور میرے حق میں گواہی دے۔ اس طرح کیس مضبوط ہو گا۔"
"سجان کا ایسا کون سا رشتہ دار ہے؟ انوشہ بجی کی شادی ہو گئی تھی اور وہ سنگاپور چلی گئیں۔ وہ سجان کے کردار کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں کیا جانتی ہوں گی۔ باقی کیا آپ سجان کے والدین اور بہنوں سے یہ توقع رکھتی ہیں کہ وہ عدالت میں آ کر آپ کے موقف کی تائید کریں گی۔ ایسا کل۔" سلیمان نے اسے حقائق سے روشناس کرایا تو وہ مایوس ہو گئی مگر علیزا کا نام ذہن میں کسی طرح چمکا اور وہ پر جوش ہو گئی۔
"علیزا... علیزا بچپن سے وہیں پلی بڑھی ہے۔ وہ سب کچھ جانتی ہے۔ وہ ضرور میرے حق میں گواہی دے گی۔"

"رانیہ! سجان اس کا رشتہ دار ہے۔ وہ سجان کی کزن ہے۔ کیا وہ ایسا کر سکے گی۔ اس طرح تو ان کے تعلقات بگڑنے کا خدشہ ہو گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ عدالت تک آ سکے گی۔ کوئی اور شخص ڈھونڈیں مثلاً سجان کے گھر میں مختلف کام کرنے والے ملازم وغیرہ۔ کیونکہ ملازم گھروں کے کردار سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا شخص ڈھونڈنا پڑے گا جو ان کا ملازم رہ چکا ہو۔" سلیمان بالکل درست پہلوؤں پر اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔

"مجھے کچھ کچھ یاد تو آ رہا ہے۔ سجان نے ایک بار معمولی سی غلطی پہ گھر میں صفائی کرنے والی زینو سے سخت مار پیٹ کی تھی۔ وہ خود ہی اس کے بعد نوکری چھوڑ کر چلی گئی مجھے اتفاق سے اس کا گھر پتہ ہے اگر وہ اب تک وہیں رہتی ہوئی تو.....؟

"دیٹس اے پوائنٹ۔ اس کو گواہی دینے کے لیے راضی کرنا میرا کام ہے۔ میں علیزا کو تمام حقائق سے آگاہ کروں گا پھر جو اس کی مرضی ہوئی۔"

"تھینک یو سو مچ سلیمان! آپ تو واقعی میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آتے ہیں جہاں میرے حوصلوں کی کمزور دیوار گرنے کے قریب ہوتی ہے آپ سہارا دینے آجاتے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتی۔" وہ بہت ممنون نظر آ رہی تھی۔

❁

سلیمان کو کچھ خبر نہیں تھی۔ گھر میں کتنا بڑا طوفان آیا ہوا ہے۔ اس پورے ہفتے میں وہ بہت مصروف رہا تھا۔ ناکافی نیند اور بھاگ دوڑ نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ اس لیے سب کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش بہت شدید ہو گئی تھی۔

شام کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر میں داخل ہوا تو خلاف معمول سناٹا سا محسوس ہوا۔ موٹی اور سنی بھی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے نہ انوشہ دکھائی دے رہی تھی۔ تیمور بھی ابھی تک نہیں آئے تھے۔

"یہ علیزا ابھی تک نہیں ہے۔" اس نے خود کلامی کی۔ دروازے سب کھلے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کوئی نہ کوئی گھر میں موجود ہے۔ اس نے لاؤنج کے بعد کچن میں جھانکا اور پھر علیزا کے کمرے کا دروازہ دھکیلا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اسے اطمینان سا ہوا۔ تھکا ہونے کے باوجود وہ اس کے انتظار میں وہیں بیٹھ گیا حالانکہ دل چاہ رہا تھا۔ نہا کر پہلے فریش ہو جائے۔ دس گیارہ منٹ کے انتظار کے بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا اور علیزا برآمد ہوئی۔ اس نے سلیمان کو نہیں دیکھا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں بال سلجھانے لگی۔ سلیمان کی طبیعت نکھری ستھری علیزا کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

کالے اور سفید رنگ کے امتزاج سے سجے شلوار قمیص میں اس کی اجلی رنگت اور بھی سفید لگ رہی تھی۔ وہ پٹہ بیڈ پہ پڑا ہوا تھا۔ گیلے بالوں نے اس کی پشت کو بھی گیلا کر دیا تھا۔ برش کرنے کے بعد وہ ڈوپٹہ اٹھانے کے لیے بیڈ کی طرف مڑی۔ اسی لمحے اس کی نگاہ سلیمان کی

طرف اٹھ گئی۔ پہلے حیرت اور پھر نفرت نے اس کی آنکھوں کا گھیراؤ کیا۔ اسے سلیمان پہ نگاہ پڑتے ہی سب کچھ یاد آ گیا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے بڑے خوش گوار موڈ میں کہا۔

''کافی دیر سے بیٹھا ہوا ہوں۔ باقی سب گھر والے کہاں ہیں؟''

''معلوم نہیں۔'' اس نے سلیمان کے سلام کا بھی جواب نہ دیا اور انتہائی سرد لہجے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ ڈوپٹہ سر پہ لیا اور باہر کا رخ کیا۔ سلیمان کو اس کا رویہ خلاف معمول سا محسوس ہوا۔ اس کا سبب بھی جان چکا تھا۔ تین روز پہلے ہی تو علیزا کی سالگرہ تھی۔ وہ ماہیے والے کام کے باعث اسے وش نہیں کر سکا تھا نہ گفٹ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اسی وجہ سے اکھڑی اکھڑی سی ہے۔ آج تھانے سے نکلتے ہی اس نے بازار کا رخ کیا تھا اور علیزا کے لیے گفٹ خریدا تھا۔ اسے علیزا کی خفگی پہ پیار سا آ گیا۔

''علیزا! فٹافٹ چائے بنا کر اوپر ہی لے آؤ۔ تمہارے لیے میرے پاس سرپرائز ہے۔''

''آپ تو خود میرے لیے سراپا سرپرائز ہیں اب اور کون سا سرپرائز رہ گیا ہے اور آئندہ اس انداز میں مجھ پہ حکم مت چلایئے گا۔ میں آپ کی زر خرید نوکرانی یا غلام نہیں ہوں۔'' علیزا کا لہجہ کچھ اور بھی کڑوا اور روکھا سا ہو گیا۔

''اچھا بیوی تو ہو ناں۔ میں نے محبت دے کر تمہیں خریدا ہے اور تم غلام کہاں ہو بلکہ تم تو......'' وہ اس کے کڑوے لہجے کو میٹھے گھونٹ کی طرح پی گیا اور اس کی راہ میں حائل ہو کر اسے شرارت سے تکنے لگا۔

''ہٹ جائیں میرے راستے سے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔'' علیزا نے اس کے سینے پہ دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دھکا دیا۔ سلیمان نے کمال اطمینان و جرات سے کام لیتے ہوئے اس کے آتش فشاں بھرے نازک وجود کو بازوؤں کے حصار میں مقید کر لیا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی ایسی پیش قدمی نہیں کی تھی۔ شاید تنہائی اور علیزا کے ناراض روپ نے اس جرات پہ اکسایا تھا ورنہ وہ ہمیشہ ایک حد کے اندر رہتا تھا۔

''اتنی ناراضی اور غصہ میری جان! تم پہ بجتا نہیں ہے۔'' سلیمان علیزا کی طرف جھکا۔ اس کے انداز تخاطب اور بے باکی نے علیزا کو گویا بارود کے ڈھیر پہ بٹھا دیا۔ اس نے بمشکل سر اٹھاتے ہوئے سلیمان کے بازو میں پوری قوت سے اپنے ناخن گاڑ دیے۔ سلیمان نے بازو وا کر لیے۔

"آئی ایم سوری علیزا! ذرا بھٹک گیا تھا مگر تم تو آج بارود بنی ہوئی ہو۔" اس کے انداز میں حیرت کے ساتھ شرارت بھی تھی۔

"آپ کہیں کہاں ذرا بھٹکتے ہیں۔ مجھے بتا سکیں گے۔" علیزا نے جلتی سلگتی نگاہوں سے اسے گھورا۔

"علیزا! آج کیوں ایسا کیا عداوت سے آج پہلی بار ایسا ہوا ہے تم میری جائز و قانونی منکوحہ ہو اس وجہ سے خود پہ سے آج ضبط و اختیار کھو دیا۔" وہ واقعی سچ بول رہا تھا۔ مگر علیزا کی نگاہوں اور عقل پہ نفرت و انتقام کا ایسا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا جس کے پیچھے ہر سچائی روپوش ہی رہتی ہے۔

"تو پھر یہ رانیہ کا کیا چکر ہے۔ جس کے ساتھ آپ دن رات گل چھرے اڑاتے پھر رہے ہیں۔"

"علیزا! پلیز اب آگے ایک لفظ نہ کہنا۔ وہ ایک دکھی لڑکی ہے۔ میں اس کی اخلاقی مدد کر رہا ہوں۔"

"ہاہا رانیہ اور دکھی لڑکی اخلاقی مدد۔ ویسے اس طرح کی دکھی لڑکیوں کی آپ کتنی بار مدد کر چکے ہیں۔" انتہائی طنزیہ انداز اور استہزائیہ لہجہ۔ وہ تھی تو سلیمان کے دماغ میں بھی آگ بھر گئی۔

"تم اس وقت بدگمانی کی انتہائی حد پہ کھڑی ہو۔"

"مجھے ہوش ہی اب آیا ہے۔ آپ سب کے اصلی، سنگدل اور بے رحم چہرے صاف طور پر مجھے نظر آرہے ہیں۔ آپ سب انتہائی گھٹیا اور کمینے......" اس کی آواز بہت بلند تھی۔ سلیمان کا ہاتھ اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ علیزا کی طرف بڑھتا، تیمور نے راستے ہی میں اس کے فضا میں معلق اٹھے ہاتھ کو روک لیا۔

"جسٹ کول ڈاؤن سلیمان پلیز کم آن۔" وہ اسے بمشکل تمام وہاں سے لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ وہ آفس سے آئے تو علیزا کے کمرے سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ تیمور نے بھی سب کچھ سن لیا تھا۔ سلیمان کا غضب آلود چہرا بتا رہا تھا کہ علیزا کے کانوں میں بھی زہر انڈیل چکی ہے۔

"بیٹھو یہاں۔ یہ لو پانی پیو۔" تیمور نے گلاس اس کی طرف بڑھایا تو اس نے اسی وقت پرے اچھال دیا۔ گلاس چکنا چور ہو گیا۔ تیمور نے پوری قوت سے اسے تھام رکھا تھا۔ اس کی حالت بپھرے سانڈ کی ہو رہی تھی۔

"اس نے ہم سب کو کمینہ لالچی اور گھٹیا کہا ہے۔ اسے جرأت کیسے ہوئی اتنی بڑی بات کرنے کی۔ اس گھر میں اسے بے پناہ محبت ملی عزت ملی اعتماد ملا اور اس نے یہ صلہ دیا ہے۔ اگر ابو جانے اس کا یہ روپ دیکھ لیا تو شاید ان کا دل ہی رک جائے۔ ہٹیں آگے سے۔ مجھے اس سے پوچھنے تو دیں۔" وہ پھر بے قابو ہو گیا۔

"سلیمان پلیز۔ اس وقت ہوش سے کام لو۔ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ علیزا تو کم عقل اور بیوقوف ہے۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں ہے کہ وہ جو الفاظ ادا کر رہی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے اور کون سے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔"

"وہ کم عقل اور بیوقوف نہیں ہے۔" سلیمان نے تیمور کو دروازے کے آگے سے ہٹا دیا مگر تیمور فوراً ہی اس کے آڑے آ گئے۔

"تم اس وقت اپنی طاقت کے زعم میں ہو۔ کیا اس پہ ہاتھ اٹھانے سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں اور یہ بھی مت بھولو کہ علیزا تمہاری انوشہ چچی کی لاڈلی بیٹی ہے۔ تم بیٹھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ہم کو عقل سے کام لینا ہوگا۔" تیمور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور رسان سے سمجھایا تو سلیمان ڈھیلا پڑ گیا۔

تیمور آہستہ آہستہ اسے تمام باتیں بتا رہے تھے۔ سلیمان کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔

❁

علیزا کے جی میں جانے کیا سمائی کہ دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب سعد ماموں کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انتظار کرتی رہی اور جب وہ منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے برآمد ہوئی تو انوشہ فوراً کچن میں ناشتہ بنانے چلی گئی۔ باہر نکلی تو علیزا شولڈر بیگ شانے پہ لٹکائے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو اس وقت؟" انوشہ نے ماں کے سے رعب سے سوال کیا مگر اپنے لہجے کے کھوکھلے ہونے کا شدت سے خود ہی احساس ہو گیا۔

"میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں۔" وہ بدتمیزی سے بولی اور گزرتی ٹیکسی کو اشارے سے روک کر سوار ہو گئی۔ انوشہ جہاں کی تہاں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

مہوش نے اسے دیکھ کر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا اور کرید کرید کر سوال کرتی رہیں۔

''انوشہ کے پاس کوئی سچ ہوتا تو صفائی دیتی ناں۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔ خود علیزا کے دل میں خلش تھی کہ انوشہ سمیت کسی نے بھی اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی۔ مہوش نے اسے اور بھی بھڑکایا۔

''علیزا! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم سلیمان سے طلاق لے لو۔ اس سے کئی گنا بہتر رشتہ تمہیں مل جائے گا۔ تمہاری قدر اور محبت کرنے والا۔ میں نے تو اڑتی اڑتی سنی ہے کہ سلیمان نے کہا ہے علیزا جیسی ہونق اور اول جلول لڑکی سے کوئی بیوقوف ہی محبت کر سکتا ہے۔ اس نے صرف تمہاری دولت کی وجہ سے تم سے نکاح کیا ہے ورنہ وہ اصل شادی تو کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماڈرن سی لڑکی سے کرے گا جو زمانے کے ساتھ چلنے والی ہو۔'' وہ تیر چھوڑ کر اب اس کے نشانے پہ بیٹھنے کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ انوشہ اور تیمور جلد از جلد تمہاری رخصتی کی بات کریں گے۔ اب کی حقیقت سامنے آ گئی ہے۔ کون چاہے گا سونے کی چڑیا اس کے ہاتھ سے اڑ جائے۔ رخصتی کے بعد سلیمان زبردستی تمہاری جائیداد اپنے نام لکھوا لے گا۔ ظاہر ہے اس وقت تم کیا کر سکو گی علیزا! تم اکیلی ہو اور تمہارے مقابلے میں وہ سارے ہیں۔ میں سوچتی ہوں تمہارا کیا بنے گا۔'' وہ غور سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں کہ پنکی بھی آ گئی۔ ساتھ ہی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی تھی۔ وہ بھی گفتگو میں شریک ہو گئی۔

''میں نے آج بھی سلیمان کو رانیہ کے ساتھ دیکھا ہے۔ دونوں ایک ہوٹل کے فیملی کیبن میں تھے۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ بے تکلفی کے کئی مراحل طے ہو چکے ہیں۔ ہائے علیزا! تمہارا کیا ہوگا۔ سجان بھائی سے طلاق کے بعد سلیمان رانیہ سے شادی کر لے گا اور تم بے چاری دیکھتی کی دیکھتی رہ جاؤ گی۔ چ چ چ۔'' وہ مصنوعی رنجیدگی سے بولی تو ہمیشہ کی طرح علیزا کو اپنے آنسو چھپانے مشکل ہو گئے۔ مہوش اسے اپنے ساتھ لگا کر تھپکنے لگیں۔ کانوں کی کچی جذباتی علیزا ہر بات پہ جلد اعتبار کر لیتی تھی۔ شدت پسندی بھی اس کے مزاج میں تھی اور اس وقت وہ جن حالات سے گزر رہی تھی۔ اس میں اسے مہوش اور پنکی کی ہر بات سچ لگ رہی تھی۔

❁

''رانیہ! مبارک ہو۔ آپ کے کیس کا فیصلہ ہونے کے قریب ہے۔ عالیہ غوری نے تو کمال کر دیا۔ مخالف وکیل کے دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔'' سلیمان اسے مبارکباد دیتے

ہوئے بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ رانیہ نے اس کی سمت دیکھا۔ گرے شلوار سوٹ میں وہ بہت جاذب نظر لگ رہا تھا۔

"آپ کو بھی مبارک ہو۔ عالیہ کہہ رہی تھیں اسی پیشی میں فیصلہ ہو جائے گا۔ اسی خوشی میں آج رات کا ڈنر میری طرف سے میرے گھر میں ہوگا میں بے چینی سے آپ کا انتظار کروں گی۔ سلیمان! آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے میرے لیے بہت بھاگ دوڑ کی......"

"بس بس آگے ایک لفظ بھی نہیں۔ میں رات کو وقت پہ پہنچ جاؤں گا۔" وہ اتھ اٹھا کر بولا۔ حسب وعدہ رات کو سلیمان ان کے گھر موجود تھا۔ کھانا کھانے کے بعد قہوہ سرو کیا گیا۔ احمد مقبول اٹھ کر چلے گئے۔ بیگم مقبول اپنے کسی اور مہمان کے ساتھ مصروف ہو گئیں۔

"سلیمان! آپ نے مجھ سے پوچھا تھا ناں۔ سجان کے ساتھ آخر میرے کیا اختلافات تھے جو بات اتنی بڑھی۔ میں نے ہمیشہ ٹال دیا۔ کچھ کچھ آپ کو پتہ چل چکا ہوگا مگر کمرہ عدالت میں میں نے ساری بات نہیں بتائی مگر آج آپ کو بتا رہی ہوں۔ سجان سے ملاقات کے بعد میں بہت جلد اس کی گفتگو اور شخصیت کے سحر میں پھنس گئی یہاں تک کہ بخوشی اس کا رشتہ منظور کر لیا گیا۔ میں جب اپنے گھر سے رخصت ہو کر سجان کے گھر پہنچی تو میری آنکھوں میں بہت خوبصورت خواب تھے۔ مگر سجان کی وحشت اور بربریت نے میرے سارے خوابوں کو تاراج کر دیا۔ یہ دیکھیں سلیمان۔ سجان کے پیار کی نشانیاں۔" رانیہ نے ڈوپٹہ شانوں سے سرکایا۔ وہ جدید فیشن کی چھوٹی اور تنگ قمیص پہنی ہوئی تھی جو بغیر آستینوں کی تھی۔

"سلیمان! میں بڑے ناز و نعم میں پلی تھی۔ سوئی بھی چبھ جاتی تو آسمان سر پر اٹھا لیتی مگر سلیمان! میں سجان کی دی ہر تکلیف ہر زخم ہر دکھ برداشت کر گئی۔" اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے سلیمان کے ہاتھوں کی پشت گرے۔

"سلیمان! کیا کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس طرح سے بھی پیش آ سکتا ہے۔ میرے جسم کے ساتھ میری روح کو بھی بری طرح روندا گیا ہے۔ میں نے سجان کے بارے میں اس قسم کی تصور تک نہیں کیا تھا۔ وہ بہت ظالم اور انتقام جو شخص ہے مگر آپ۔ آپ ایسے نہیں ہیں۔ آپ تو بالکل اس سے الٹ ہیں۔" اس نے سلیمان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ یہ حرکت اس سے اضطراری کیفیت میں سرزد ہوئی تھی۔ اس نے بمشکل نگاہوں کا زاویہ بدلا۔ اس نے اپنے دل میں رانیہ کے لیے عجیب سا درد محسوس کیا۔ ایک نا محسوس سی اپنائیت سے وہ کچھ کھو گئی

نام دے سکتا تھا اگر وہ سا بارے میں زیادہ غور کرتا تو علیزا کا تصور مجسم سوالیہ نگاہ بن جاتا تھا۔ اس نے تسلی دینے کے لیے کچھ بولنا چاہا مگر اسے یوں لگا اس کے الفاظ محض الفاظ رانیہ کے دکھ کا ازالہ کر پائیں گے۔

سلیمان وہاں سے اٹھا تو اسے اپنے دل ودماغ پہ بے پناہ بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ علیزا بہت ضدی ہو رہی تھی۔ مہوش نے اسے بتایا تھا۔ تم بہت ساری جائیداد کی مالک ہو۔ سب کچھ تمہارا ہے اب اس گھر میں وہ مالکانہ جذبے کے ساتھ رہ رہی تھی۔

بھولے بھٹکے سے ان دنوں اگر سلیمان کو علیزا نظر آجاتی تو غیظ وغضب سے اس کی نسیں کھنچ جاتیں اور چہرا سرخ ہو جاتا۔ علیزا کے ہاتھوں اپنی توہین یاد آجاتی تو اس کا جی چاہتا علیزا کو چھٹی کا دودھ یاد کرا دے۔

❁

مہوش زور زور سے رو رہی تھیں۔ سعد ان کے سامنے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھے تھے۔ پورا کمرا کسی میدان کارزار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی روشی منال کو لے کر وہاں سے گئی تھی۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ اب مزید اس گھر میں نہیں رہے گی۔ حیدر اور عفان کو پتا چلنے پر جانے اب کون سا طوفان آنا تھا۔

سعد کسی دوست کی طرف گئے ہوئے تھے۔ مہوش اپنے کمرے میں بلڈ پریشر کی دوا کھا کر لیٹی ہوئی تھیں۔

چنکی اور سلمی دونوں بہنیں رومانہ کی برتھ ڈے پہ مدعو تھیں۔ منال کو اس کا علم نہیں تھا ویسے بھی وہ کم ہی انکی تفریحات میں شریک ہوتی تھی۔ منال کو چنکی سے کوئی کام تھا اس لیے وہ ان کی طرف آگئی تھی بدقسمتی سے پہلا سامنا ہی سجان سے ہوا اس کی نگاہیں منال کو جیسے اندر تک اتار رہی تھیں۔ بڑا تنگ پائنچوں والی ٹراؤزر نما شلوار اور اس کے ساتھ کی سبز اور کالی پرنٹڈ ہاف سلیوز قمیض میں منال ایک ہلکا سا اسکارف گلے میں لپیٹے بے باکی کا مکمل نمونہ لگ رہی تھی۔ چنکی اور سلمی بھی اسی حلیے میں رہتی تھیں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

''سجان بھائی! چنکی کہاں ہے؟'' وہ متلاشی نگاہوں سے کمرے میں جھانک رہی تھی اسے جان کی طلب جاگ اٹھی تھی۔ منال کو اس نے اس نظریے سے پہلی بار دیکھا تھا اور وہ واقعی دیکھنے کی چیز لگ رہی تھی گلابی رنگ میں ایک ہلکا سا داغ دھبہ تک نہ تھا۔

"اندر میرے کمرے میں ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ منال آگے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دبے قدموں اس کی پشت پر جا پہنچا۔ منال کو پہلو میں کھڑے خطرے کا احساس ہوگیا اور اس نے زور زور سے چیخنا شروع کردیا۔ عین اس وقت مہوش آگئیں' روشی بھی بھاگی آئی' بدقسمتی سے سعد بھی اسی وقت گھر پہنچے۔ سجان اتنے سارے افراد کو دیکھ کر راہ فرار اختیار کرگیا۔ روشی نے بے نقط سنائیں۔

"مہوش! میں اب سجان کو گھر میں گھسنے نہیں دوں گا' اس کے کسی قول وفعل کا میں ذمہ دار نہیں' تم ضرور ہو' اس کی ذہنی واخلاقی بیماری اتنی بڑھ چکی ہے کہ کل کو پنکی اور سمکی بھی اس کا نشانہ بن سکتی ہیں۔ کاش تم بہت پہلے میری بات سن لیتیں۔ اگر ہم اسے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھاتے تو شاید اس کی ذہنی ٹیڑھ دور ہو جاتی۔ تشدد پر مبنی فلمیں دیکھ دیکھ کر وہ خود کو بھی ان کا ایک کردار محسوس کرنے لگا' تمہاری لاپرائی و بے نیازی اور قصداً نظر انداز کرنے کی عادت نے یہ دن دکھائے۔ رانیہ جیسی بے مثل دبے بہا لڑکی کو اس نے تقریباً تباہ کرہی دیا ہے۔ کتنی اور شکایتیں آئیں مگر تم نے تو میری حسیات کو مفلوج کردیا تھا۔ جانے تمہارے پاس کون سا گر تھا۔ میں تمہارے کانوں سے سنتا' تمہاری آنکھوں سے دیکھتا اور تمہاری زبان سے بولتا۔ کاش میں ایسا نہ کرتا۔ سجان ذہنی وجسمانی اذیت دینے والے نشے کی لت میں پڑ گیا ہے' اس سے چھٹکارا پانا تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ میری بات سن تو سجان کا انجام بہت برا ہوگا۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے میرے بڑھاپے کا سہارا' میرا دایاں بازو اور وہ بھی......" سعد کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح گر رہے تھے' وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

❁

کمرہ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سعد کے گھر سمیت رانیہ کے عزیز رشتہ دار بھی فیصلہ سننے جمع تھے۔ آج اس کے کیس کی آخری پیشی اور فیصلے کی تاریخ تھی۔ صحافی پریس فوٹو گرافر اور دوسرے اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ رانیہ سجان کے کیس کو آخری چند پیشیوں سے شہرت ملی تھی۔

"ابھی تک سلیمان نہیں آئے؟" رانیہ بار بار بے چینی کا اظہار کر رہی تھی۔

"آرہے ہوں گے آخر کا مصروف زندگی ہے اور تم اتنی پریشان مت ہو' تمہاری زندگی میں تو وہ آہی چکے ہیں بہار بن کر بلکہ روح افزا ٹھنڈک بن کر۔"

ہوئی۔سجان مرنے سے پہلے ایک بار ہوش میں آیا' اس کے لبوں پر رانیہ کا ہی نام تھا۔

رانیہ اس سے تین دن پہلے ہی یہ دنیا چھوڑ چکی تھی' وہ اپنے پیچھے ایک ایسی المناک داستان چھوڑ گئی تھی' جس کا ورق ورق آنسوؤں سے دھلا ہوا تھا۔سلیمان تعزیت کے لیے انوشہ اور تیمور کے ہمراہ رانیہ کے گھر گیا۔احمد مقبول مرد ہوتے ہوئے بھی بالکل بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

سجان کی موت نے مہوش کو تھرا دیا تھا اور رانیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس نے مہوش جیسی مضبوط اعصاب کی مالک کو بھی رلا دیا تھا۔اس آہ و زاری کے دوران ان کے منہ سے بہت سی باتیں از خود نکل گئی تھیں' ایسے سچ جن سے مہوش کی شخصیت پرت در پرت سامنے آ کر کھل گئی تھی انوشہ کو بھابی سے نفرت کے ساتھ ان پر ترس بھی آیا۔اتنے برسوں سے وہ شطرنج کی بساط پہ جو مہرے کھیل رہی تھیں وہ اب آ کر پٹ گئے تھے' علیزا نے انکا اعتراف نامہ بغور سنا تھا اور پھر اس کا جی چاہا تھا۔کاش زمین پھٹے اور وہ اپنی شرمندگیوں سمیت اس میں سما جائے۔اس نے کتنے محبت کرنے والے لوگوں کا دل توڑا تھا جو اسے بنا کسی غرض کے چاہے چلے جا رہے تھے۔انہیں کسی ستائش و صلے کی تمنا نہ تھی۔

وہ انہیں غاصب و جابر اور ڈاکو سمجھتی رہی۔یہ تصور کرتی رہی کہ وہ اس کے باپ کی دولت پہ عیش کر رہے ہیں۔اب یہ عقدہ کھلا تھا کہ اس کا باپ اس کے لیے ایک پیسہ نہ چھوڑ کر گیا تھا۔اس کے مرنے کے بعد انوشہ کو ایک پھوٹی کوڑی تک نہ ملی تھی۔وہ تن کے کپڑوں میں اسے لے کر بھائیوں کے پاس آئی تھی جہاں بھابی نے اسے کولہو کا بیل بنا دیا۔وہ تو خوش قسمتی سے اسے تیمور جیسا ہم سفر مل گیا ورنہ دکھوں کی طویل رات کبھی ختم ہوتی نظر نہ آ رہی تھی۔

پھر مہوش نے انوشہ سے اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے علیزا جیسی معصوم بچی کا سہارا لیا۔اس کی خوب برین واشنگ کی اور سائیں جمن مسے اُلٹے سیدھے تعویذ لا کر پلاتی رہیں وہ ماں کو ماں سمجھنے سے ہی انکاری ہو گئی اور اس کے ساتھ جانے سے ہی انکار کر دیا۔

ماں کے بعد مہوش نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا' وہ اعتماد و اعتبار سے محروم شخصیت بن کر رہ گئی۔سجان نے اسے اپنی ماں کا دیا دل پسند کھلونا سمجھا۔یہ علیزا کی خوش قسمتی ہی تھی وہ سجان جیسے دراز دست شخص سے بے عزت ہونے سے محفوظ رہی تھی انوشہ کس کس کا غم کرتی۔

پہلے علیزا کے رویے پھر رانیہ کے دل خراش قتل اور پھر سجان کی حسرت ناک موت۔اب مہوش کی نقاب کشائی۔اسے تو یہاں ٹھہرنا دو بھر ہو گیا۔

وہ سوئم کے بعد بوجھل دل کے ساتھ اپنے گوشہ عافیت میں واپس آگئی۔ سجان کی ملامیت سے قطع نظراس کی خودکشی اور موت نے اسے بہت دکھی کیا تھا۔ وہ اس کے بھائی کا سہارا تھا۔ سعد کی تو حالت دیکھی ہی نہ جاتی تھی۔

❁

سنی اسے کھانے کے لیے بلانے آیا تھا۔ وہ دروازے سے ہی کہہ کر پلٹ گیا جیسے یہ ڈر ہو کہ علیزا آئی اسے مار کر یا ڈانٹ کر کمرے سے نکال دیں گی۔ وہ اپنی پلیٹ پہ جھکی بے دلی سے کھانا زہر مار کر رہی تھی حالانکہ آج اسی کی پسندیدہ ڈشز تھیں۔ چکن بریانی، مٹن کوفتہ اور میٹھے میں زعفرانی کھیر۔ مگر اسے کوئی چیز بھی مزا نہ دے رہی تھی۔ جہانگیر کسی کاروباری سلسلے میں باہر گئے تھے سلیمان، جہانگیر کی غیر موجودگی میں ان کے ساتھ ہی روز کھانا کھاتا تھا۔ علیزا کی طرح وہ بھی بے دلی سے لقمے توڑ رہا تھا۔ رانیہ کی موت کو کافی دن گزرنے کے باوجود اب تک وہ افسردہ اور دل گرفتہ تھا۔

علیزا کو بھی رانیہ کی بے وقت موت کا بہت زیادہ افسوس تھا۔ وہ کئی بار بند کمرے میں اس کے لیے روئی تھی۔ مگر سلیمان کا اتنا اثر لینا اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد سلیمان اور رانیہ کا ذکر چھڑ گیا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، رانیہ میرے لیے اتنی اہم کیوں ہوگئی تھی۔'' سلیمان کہہ رہا تھا ''اس کے لیے اپنے احساسات میں بیان نہیں کرسکتا۔''

علیزا کی ساری حسات کان بن گئیں۔

''سلیمان! رانیہ تھی ہی بہت اچھی اور چاہت کے قابل۔ مجھ سے تو اس کے والدین کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔'' شدت جذبات سے انوشہ کی آواز بھرا گئی تو تیمور نے اسے تھپکی دی۔

ماحول پہ عجیب سی سوگواری چھا گئی تھی۔ علیزا نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے کرسی دھکیلی اور تقریباً وہاں سے بھاگتی ہوئی نکلی۔

سلیمان رانیہ کی خاموش محبت کی شوریدہ سری سے ڈر گیا تھا۔ اس نے رانیہ سے علیزا کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ بعد میں اس کی موت اور علیزا کی بدگمانی نے اسے بہت افسردہ کر دیا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اپنے دل کو علیزا کی طرف مائل نہ کرسکا تھا۔

سلیمان اب جہانگیر کو بہت مس کرنے لگا تھا۔ بچ تو یہ ہے کہ باقی سب بھی ان کی کمی محسوس کر رہے تھے جو تین ماہ ہو گئے تھے ان کو گئے ہوئے۔

دوسرے روز کے دن وہ اچانک واپس آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی علیزا کا پوچھا۔ وہ تین روز سے بخار میں پھنک رہی تھی۔ جہانگیر اسی وقت اس کے پاس پہنچ گئے۔ علیزا ان کے سینے لگ کر اس طرح روئی کہ خود ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''میں نے تمہیں وہاں بہت مس کیا۔ دیکھو تو تمہارے لیے میں نے کتنی ڈھیر ساری شاپنگ کی ہے۔''

''تایا جان! مجھے کچھ نہیں چاہیے آپ واپس آ گئے ہیں۔ یہی کافی ہے۔ آپ کے بغیر بہت تنہا اور اکیلی رہ گئی تھی۔ بھیڑ میں گم ہو جانے والے بچے کی طرح۔'' وہ ان کے پر شفقت سینے سے لپٹی جانے کیا کچھ کہتی رہی۔ جہانگیر نے اسے بخار کا اثر سمجھا۔ باہر سلیمان ان کے کمرے سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ دو ساعتی گھنٹے ہو چکے تھے انہیں علیزا کی دلداری و ناز اٹھاتے ہوئے۔ وہ تن فن کرتا ان کے پیچھے ہی چلا آیا اور وہیں ٹھٹک گیا۔ جہانگیر نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے علیزا کے پاس سے اٹھے تاکہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔ وہ اس حد درجہ احتیاط و محبت پہ سنگ کر رہ گیا۔ وہ کہاں اسے اصول جذبوں کے قابل تھی خود غرض لڑکی۔

سونے سے پہلے علیزا کو دیکھنے انوشہ اور تیمور آئے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ تیمور نے اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''ممی! آپ تم سو جاؤ۔ میں علیزا کے پاس ہوں۔ علیزا کو دوا بھی دینی ہے۔ تم نے نوٹ کیا ہے کتنی حساس ہو گئی ہے یہ۔ ذرا ذرا سی بات پہ رو پڑتی ہے۔ دوا بھی نہیں پیتی خود سے۔'' تیمور کے ہر ہر انداز سے اس کے لیے محبت عیاں تھی۔ پہلے وہ اسے ڈرامہ اور لالچ ہی کہتی تھی۔ اچانک اٹھ بیٹھی۔ وہ دونوں اسے سوتا سمجھ رہے تھے۔ وہ جاگ رہی تھی اور ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ بھی سن چکی تھی۔

''آئی ایم سوری تیمور انکل! میں بہت بری ہوں جو آپ سب کو غلط سمجھا۔'' وہ واقعی شرمندہ تھی۔ پل بھر میں ماحول بدل گیا۔ تیمور اسے سینے سے لگائے اس کے بال سہلا رہے تھے۔

''تم میری بیٹی ہو اور بس اس کے علاوہ کچھ مت سوچو۔''

جہانگیر جوڑوں کے درد کی وجہ سے بار بار سیڑھیاں چڑھ اتر نہیں سکتے تھے رات کا کھانا سب ان کے ساتھ اوپر ہی کھاتے تھے۔ انوشہ اور علیزہ مل کر یہ اہتمام کرتی تھیں اور کھانا پکانے کا سارا کام ادھر ہی ہوتا تھا۔

"علیزہ بیٹی! بار بار اوپر نیچے بھاگ دوڑ میں لگی رہتی ہو۔ جی چاہتا ہے اب تمہیں مستقل طور پہ ہی اوپر لے آؤں تاکہ ان بار بار کے چکروں سے تمہاری جان چھوٹے۔" وہ ابھی ابھی نیچے سے ہاٹ پاٹ لائی تھی۔

جہانگیر نے شرارت سے جملہ کسا۔ سب دسترخوان پہ موجود تھے۔ وہ جھینپ گئی اور کچن میں آ گئی۔ سونی کھانسنے لگا۔ سنی نے شریر نگاہوں سے سلیمان کو دیکھا۔

"انوشہ اور تیمور عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں تم دونوں کا انتظار کروں گا۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"جی اچھا ابا جی۔" دونوں بیک وقت سعادت مندی سے بولے تو ان کا دل خوشی سے مسرور ہو گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد سب نے مل کر کھانا کھایا بعد میں چائے کا دور چلا۔ علیزہ نے اس چائے بنائی سب ابھی تک دسترخوان پر ہی موجود تھے سوائے سلیمان کے۔ انوشہ نے چائے کا مگ علیزہ کو دیتے ہوئے کہا کہ سلیمان اپنے کمرے میں ہے وہ اسے وہیں چائے دے آئے۔ وہ ہچکچائی۔ انکار بھی نہ کر سکی تھی۔

علیزہ نے ہلکے سے دروازہ بجایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سلیمان فون رکھ کر پلٹ رہا تھا۔

"یہ لیں چائے۔" اس نے خاصی ہمت سے کام لیا اور کپ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ کپ تھامنے کے بجائے سرد نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"پلیز اپنی چائے سمیت یہاں سے تشریف لے جائیں۔" اس کا لہجہ اجنبی اور روکھا تھا۔ تیور خوفناک تھے۔ یوں لگ رہا تھا اگر اس نے ذرا بھی ہٹ دھرمی دکھائی تو وہ اسے باہر نکال دے گا۔ وہ وہیں سے واپس آ گئی۔ صد شکر کہ سب اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے کسی نے اس کی متغیر رنگت کو نہیں دیکھا۔

"علیزہ! اپنی پلیٹ ادھر رکھو، نہ کی اتنی مرچ تو تمہیں لگتی ہیں۔" وہ تندی سے بولی۔

سونی اور سنی اس دور کے بچے تھے۔ سلیمان کی ناراضی ان سے پوشیدہ نہیں تھی۔

انوشہ سلیمان سے کیسے کہتی کہ علیزا سے ناراضی ختم کرو۔ تیمور نے البتہ سلیمان کو اکیلے میں بہت سمجھایا تھا۔

"سلیمان! علیزا تمہاری منکوحہ ہے۔ اکا بھائی کی عزیز از جان ہستی اگر ان کے علم میں یہ سب آ گیا تو بہت برا ہوگا۔ میں رانیہ کے لیے تمہارے خصوصی جذبات سے اچھی طرح واقف ہوں مگر ذرا سوچو تو تم اپنے ساتھ علیزا سے بھی زیادتی کر رہے ہو۔ میں اپنی بیٹی کے سلسلے میں کوئی زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔" تیمور کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ سلیمان بڑی طرح گڑبڑایا۔

"چچا جان! بات وہ نہیں ہے جو آپ سوچ رہے ہیں۔ میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ علیزا میری بیوی ہے مگر رانیہ کی حیثیت کا تعین میں ابھی تک نہیں کر سکا ہوں نہ جانے وہ میرے لیے کیا تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دل میں دکھ کی لہری اٹھتی ہے۔ وہ مدد لینے کے لیے میری طرف بڑھی تھی۔ میں اس کے بارے میں کچھ اور طرح سے سوچنے لگا تھا مگر اس میں کہیں بھی بری نیت کو دخل نہیں تھا۔ میرے دل میں خلش سی ہے میں نے ایک بار بھی اسے اپنے اور علیزا کے تعلق کے بارے میں نہیں بتایا نہ جانے میں نے ایسا کیوں کیا۔" اندرونی اضطراب اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔

"سلیمان! کوئی بھی موسم ہمیشہ نہیں رہتا۔ وقت آتے جاتے موسموں کا نام ہے۔ رانیہ بھی اک ایسا ہی موسم تھا غیر یقینی، جبکہ علیزا تمہاری مستقل ہم سفر ہے۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ مجھے اس کے لیے بٹا ہوا سلیمان نہیں بلکہ پورا سلیمان چاہیے ورنہ تمہارے پاس ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔ علیحدگی کا راستہ۔" وہ سنگ دلی سے بولے تو سلیمان لمحہ بھر کے لیے حیران سا ہوا۔

"چچا جان! آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اس حد تک گر بھی سکتا ہوں علیزا کو میں اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتا۔ وہ صرف ابا جان کی ہی نہیں میری بھی خواہش ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے ناں رانیہ کے لیے سوچتے ہوئے میں الجھ سا جاتا ہوں۔"

"تو جو چیز شک میں ڈالے اسے چھوڑ دو۔"

"اسی کوشش میں ہوں۔"

"اب علیزا سے کوئی جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چچا جان! آپ بھی حد کرتے ہیں۔" وہ اسی قدر کہہ سکا۔ بہرحال تیمور سے بات

لڑنے کے بعد اس کی ذہنی کشیدگی ختم ہو گئی تھی

علیزا جہانگیر کے ساتھ بیٹھی ان سے نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کر رہی تھی۔

"سلیمان! اپنے کمرے سے وہ کالا شاپر اٹھا کر لانا۔" وہ ذرا دیر کے لیے سلیمان کی طرف مڑے۔ وہ سعادت مندی سے سر کو جنبش دے کر اٹھا اور فوراً تعمیل کی۔ انھوں نے علیزا کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟"

"کھول کر دیکھو۔ میں نے سلیمان سے کہا تھا۔ تمہارے لیے کپڑے لے آئے۔ ساتھ کچھ اور چیزیں ہیں۔ دیکھو تو کیسی ہیں۔" اس نے اشتیاق سے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ اندر سے فیروزی اور ڈیپ بلو کلر کا خوب صورت سا سوٹ برآمد ہوا۔

"یہ تو بڑا قیمتی اور دلکش سا ہے۔ کون سے بوتیک سے لیا ہے۔ میرے ناپ کا ہے بالکل۔" جہانگیر اس کے بے ساختہ انداز پہ مسکرائے۔

"تم سے زیادہ قیمتی اور انمول کون ہوگا۔ رہ گیا بوتیک تو سلیمان کو پتہ ہوگا وہی لایا ہے اگر تمہیں اس بوتیک سے اور کپڑے لینے ہوں تو سلیمان کے ساتھ چلی جانا۔ میں آج بہت خوش ہوں۔ میرا انتخاب لاجواب ہے میری نگاہیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ علیزا تم مجھے ہیرا ہے۔ نیک اور شائستہ بچی۔" وہ مڑ کر سلیمان سے مخاطب ہوئے تو وہ خاموش رہا جیسے چپ کی زبان میں تائید کر رہا ہو۔

"ابو! سلیمان بھائی آپ سے ناراض ہیں۔ ہم نے شرط لگائی ہوئی ہے کہ صلح کرائیں گے۔" سلیمان اس غیر متوقع بات پہ بیچ علیزا کے پیچھے چھوٹ گئے۔ اسے ہرگز اندازہ نہ تھا وہ ان کے سامنے ہی بھانڈا پھوڑ دے گا۔

"سلیمان! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" وہ کڑک کر بولے تو سلیمان نے علیزا کو گھورا مگر وہ اس کی طرف کہاں دیکھ رہی تھی۔ وہ تو نظریں زمین میں گاڑے اپنی شامت کا انتظار کر رہی تھی۔

"چلو فوراً ناراضی ختم کرو۔ علیزا سے ہاتھ ملاؤ۔" وہ سر پہ کھڑے تھے چاروناچار ان کے حکم پہ عمل کرنا پڑا۔ اس نے علیزا کا ہاتھ زور سے دبایا اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سلیمان نے بازی کیسر بدلہ چکا لیا تھا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔ آئندہ مجھے ناراضی کی خبر نہیں ملنی چاہیے۔ سلیمان جاؤ علیزا کو

بازار لے جاؤ۔" جہانگیر کے انداز میں اس کے لیے ایک ننھے بچے کی سی محبت رچی ہوئی تھی۔
سلیمان منہ سے کچھ نہیں بولا گاڑی کی چابی لے آیا۔ علیزا اپنے کمرے میں چادر اوڑھ کر آ گئی۔
بازار میں بہت رونق تھی۔ دکانیں روشنیوں سے منور تھیں۔ لوگ بے فکری سے خریداری کر رہے تھے۔ سلیمان نے پہلے ان دونوں بھائیوں کو ان کی مطلوبہ اشیاء دلائیں۔ علیزا چوڑیاں پسند کر رہی تھی۔ اس نے فیروزی کپڑوں کے ساتھ میچ کرتے دو سیٹ لیے اور پھر تین سیٹ اور خریدے۔ مہندی کے ساتھ کچھ اور چیزیں لیں۔ ایک جگہ اسے کریم اور سلور رنگ کی چوڑیاں پسند آ گئیں۔

"پہنا دوں۔" دکاندار چوڑیاں ہاتھ میں پکڑے علیزا کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"جی نہیں۔ آپ پیک کر دیں۔" سلیمان بولا۔ سلیمان نے ادائیگی کی۔ خلاف توقع بہت جلدی وہ گھر آ گئے۔ موتی اور سی تھکے ہوئے تھے آتے ہی سو گئے۔
"چوڑیاں پہنیں گے۔" علیزا نے دروازہ بڑھتے سلیمان سے کہا۔
"جی نہیں۔" اس کے لہجے میں بہت سرد مہری اور رکھائی سی تھی۔ اس نے بمشکل، خود کو رونے سے باز رکھا۔ علیزا اپنی غلط فہمیوں پہ نادم تھی۔ وہ شاپر رکھ کر اندر آئی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"اس وقت کس کا فون آ گیا۔ اس نے سوچتے ہوئے فون اٹھایا۔ دوسری طرف رمشہ تھی۔ سلیمان کی اکلوتی بہن۔ علیزا کی اور اس کی فون پہ اکثر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی تصویریں بھی دیکھ رکھی تھیں۔
"تمہارے لیے میرے پاس ایک خوشی کی خبر ہے۔"
"کون سی بھئی؟"
"شادی کی......"
"کس کی شادی کی......"
"تمہاری شادی کی اور کس کی۔ اب بنو تو مت۔ ابو جان نے کل مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ ایک ہفتے بعد تم مایوں بیٹھ رہی ہو۔" علیزا کے لیے یہ انکشاف ہی تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہی ہو گئی۔
"آپ کب آ رہی ہیں؟"

"میں کل رات پہنچ رہی ہوں۔ میرے اکلوتے بھائی کی شادی ہے۔ تمہیں رو برو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ تصویروں میں تو بہت پیاری ہو۔ ابو جان تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میری ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں اور سلیمان پتہ ہے کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے میں علیزا سے کبھی کبھی جیلسی فیل کرنے لگتا ہوں۔" "بوا سے اتنی توجہ دیتے ہیں۔ اس کے آنے کے بعد مجھے تو وہ سوتیلی اولاد سمجھنے لگے ہیں۔"

رمشہ مزے سے بولی۔ علیزا ایک بار بھی درمیان میں نہیں بولی، ویسے بھی رمشہ بہت باتونی تھی۔ خود ہی سوال کرتی۔ خود ہی جواب دیتی۔ اس نے فون بند کیا تو سوچوں میں گم ہوگئی۔

اسے کسی نے بتایا تک نہ تھا اور سلیمان ابھی تک منہ بنائے پھر رہا تھا۔ انوشہ رات اس کے کمرے میں آئی تو علیزا جاگ رہی تھی۔ اس نے بڑی محبت سے اسے گلے سے لگالیا۔

"اب سو جاؤ۔ صبح سویرے اٹھنا ہے بہت کام ہے۔ کل سے ٹھیک ٹھاک میرا ہیلپ ہوا کرے گی میری اور تم خوامخواہ کچھ مت سوچو میں چاہتی ہوں میرے بھی شادی کے دن دنیا کی حسین ترین دلہن نظر آئے۔" علیزا اندوہ ہوگئی اور ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اسے اب کہاں نیند آئی تھی۔ اس نے بک شیلف سے ایک شعری مجموعہ نکالا۔ اپنی پسندیدہ غزل کو پڑھتے ہوئے اسے پہلی بار یوں لگا جیسے اس کا دل قطرہ قطرہ کرکے پگھل رہا ہو۔

ہجر میں خون رلاتے ہو کہاں ہوتے ہو
لوٹ کر کیوں نہیں آتے کہاں ہوتے ہو
سرد راتوں میں کیسے تمہیں بھلا سکتی ہوں
آگ سی دل میں لگاتے ہو کہاں ہوتے ہوں
شہر کے لوگ بھی یہی سوال کرتے ہیں!
اس بہت کم نظر آتے ہو کہاں ہوت ہو

اس نے کتاب تکیے پر اوندھی کردی۔

"پتہ نہیں سلیمان صاحب کیا کررہے ہوں گے۔ اپنی ناکام محبت کا سوگ منارہے ہوں گے۔" وہ بدگمانیوں کے سمندر میں تہہ در تہہ اترنے لگی۔

❁

صبح بہت ہنگامہ خیز تھی۔ انوشہ اکیلی ہی سب کچھ کررہی تھی علیزا کا کمرے سے نکلنے

کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا مگر مما کی مصروفیت دیکھ کر اس ترس آ گیا۔ آہستہ آہستہ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔

"بھابھی! کپڑے بدل لو۔ کتنا رف سا حلیہ ہو رہا ہے۔ شام کو مایوں بیٹھو گی نا۔ ابھی جاؤ اس چینج کرو۔" نوشہ نے سہولت سے اسے ٹوکا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔ اس کی نگاہ انتخاب اسی فیروزی اور بلیو کلر کے سوٹ پہ جا رکی جو سلیمان دیا تھا۔ منال اور روشی بھی آ چکی تھیں۔ روشی نوشہ کے ساتھ مصروف تھی۔ منال علیزا کے کمرے میں ہی آ گئی۔

"خوب جچ رہی ہو اس سوٹ میں۔" اس نے تعریف کی۔ سلیمان اور تم دوپہر میں لوٹے۔ آنٹ تو جہانگیر بھی پیچھے ہی تھے۔ آتی جاتی علیزا کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے۔

"علیزا! تمہارے سسر کتنے اچھے ہیں۔" منال نے رشک سے ان کی طرف دیکھا۔ علیزا جہانگیر کی دوائی دینے اوپر آئی جو ان کے کمرے میں سائیڈ ٹیبل پہ پڑی ہوئی تھی۔ سلیمان کی کزنز اوپر وہیں چھوٹے موٹے کام سرانجام دے رہی تھیں۔ ساتھ سلیمان سے چھیڑ چھاڑ اور ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

"علیزا! سلیمان سے ناراضی تو نہیں چل رہی ہے جو یوں بیگانوں کی طرح پاس سے گزر گئی ہو۔"

نوال خاصی منہ پھٹ سی تھی۔ اس نے سلیمان کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔ منہ بنا کر کے اسے آرام سے بولی کہ علیزا جیسی محتاط لڑکی بھی گڑبڑا گئی۔

"ہاں بھئی۔ سلیمان پولیس آفیسر ہیں۔ یہ نہ ہو اس پر بھی کوئی دفعہ لگا دیں۔"

سونیا کی آواز پر قہقہوں سے گونج اٹھا۔ علیزا ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی نیچے اتر آئی۔ حاضر جواب بذلہ سنج لوگوں میں بیٹھتے ہوئے اسے ہمیشہ ایک قسم کا احساس کمتری لاحق رہتا۔ وہ اس طرح سے کسی پہ بھی جملے نہیں کس سکتی تھی۔

شام کے بعد اصل چہل پہل شروع ہوئی۔ سلیمان کے دوست رشتہ دار کزنز خالہ پھپھو سب آ گئے۔ علیزا کمرہ نشین ہو گئی۔ تیسرے دن اس کی رخصتی تھی۔

سونی اور رمشی میوزک کی تال پہ بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ علیزا کی مہندی کا فنکشن جاری تھا۔ رمشہ بھی آ چکی تھی۔

رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ جب اچانک جہانگیر کی طبیعت بگڑ گئی۔ سلیمان

... اور رضا انہیں لے کر فوراً ہاسپٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ رمشہ اور مانوشہ بھی ان کے پیچھے چلی گئیں۔ اب وہ اکیلی گھر میں تھی کیونکہ باقی جو رہ گئے تھے۔ وہ بھی پریشان ہو کر ایک ایک کر کے ہاسپٹل چلے گئے تھے کیونکہ جہانگیر کی حالت خاصی سیریس تھی۔ اس کے پاس صرف منال تھی جو برابر اسے تسلی دے رہی تھی کیونکہ علیزا مسلسل رو رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کچھ ہونے والا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ سے بہتری کی امید رکھو۔ تم تو ان سے اتنی محبت کرتی ہو محبت کرنے والوں کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔"

وہ مسلسل اس کی ہمت بندھا رہی تھی۔ علیزا کے ہاتھ بے اختیار دعا کے انداز میں پھیل گئے۔ وہ گیٹ کے آس پاس چکر کاٹ رہی تھی کہ شاید ہاسپٹل سے کوئی آجائے اور جہانگیر کے بارے میں پتہ لگے۔

وہ رات بھر نہیں سوئی۔ اب صبح صادق کے آثار نمایاں ہو رہے تھے جب جانی پہچانی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ چوکیدار نے جونہی گیٹ کھولا۔ وہ بے تابی سے تقریباً بھاگ کر آگے آئی۔ آنے والا سلیمان تھا۔

"کیا ہوا؟ تایا جان ٹھیک تو ہیں ناں؟ انہیں کچھ ہوا تو نہیں ہے ناں؟ ان کی حالت زیادہ سیریس تو نہیں ہے۔" ایک ہی سوال مختلف رنگ میں تھا۔ سلیمان نے اس کی طرف دیکھا۔ شدت گریہ سے ابھی تک اس کی آنکھیں سوجی سوجی اور سرخ نظر آرہی تھیں۔ کلائیوں میں گیندے اور موتیے کے پھول مرجھائے مرجھائے سے تھے زرد لمبے کپڑوں میں وہ خود بھی زرد سی لگ رہی تھی۔

"ابو جان پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ معمولی سا ہارٹ اٹیک تھا۔"

"میں بھی ہاسپٹل جاؤں گی۔" وہ مچل گئی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب وہ ٹھیک ہیں پہلے ہی ہاسپٹل میں سب جمع ہیں۔ خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنے گا۔ شام میں شادی کا فنکشن ہے اور یہ ہاسپٹل جانے کے لیے بے قرار ہے وہاں جا کر رونا دھونا شروع ہوگا۔ ابو جان کی طبیعت جو سنبھل رہی ہے پھر خراب ہو جائے گی۔" سلیمان ڈپٹ کر بولا تو اسے شدت سے رونا آیا۔ اسے سلیمان کی باتوں کا ذرا بھی یقین نہ تھا کہ تایا جان بالکل ٹھیک ہیں۔

وہ سب واپس آگئے۔ اب سلیمان ان کے پاس تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جہانگیر کو ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ واپس آئے تو علیزا نے بمشکل خود کو رونے سے باز رکھا کیونکہ سلیمان کی باتوں کا اثر جو تھا۔

"تایا جان! میں بہت پریشان تھی۔ میں نے اتنی دعائیں مانگیں۔"

"مجھے معلوم تھا۔ میری بیٹی بہت پریشان ہوگی۔ اس لیے تو میں ٹھیک ٹھاک ہو کر واپس آ گیا ہوں۔" وہ اب بھی تو بہت زردہ دکھائی دے رہے تھے۔

"سچ بتائیں۔ آپ بالکل ٹھیک ہیں ناں؟"

ہاں بھئی۔ میں سو فی صد فٹ اور صحت مند ہوں۔" وہ اس کی محبت کا خیال کر کے آسودہ سے ہو گئے۔ پھر شادی کی پوری تقریب کے دوران وہ ہشاش بشاش رہے۔ کھانے کے بعد علیزا کی رخصتی اس طرح ہوئی کہ جہانگیر اسے تھام کر بڑے فخر اور مان سے اوپر لائے۔ آج خوشی ان کے روم روم پھوٹ پڑ رہی تھی۔ انہوں نے علیزا کو سلامی اور منہ دکھائی میں سونے کے کنگن اور کیش رقم دی۔ رمشہ نے وائٹ گولڈ کا سیٹ دیا۔ نوال، سمیعہ، رمشہ اور سلیمان کی دیگر کزنز کچھ دیر علیزا کے پاس بیٹھی رہی پھر وہ بھی چلی گئیں۔ رمشہ بھی نیچے آ گئی۔

سلیمان دوستوں کو رخصت کر رہا تھا۔ علیزا جہانگیر کے پاس تھی۔ انہیں سانس کی تکلیف ہوئی تو وہ بے پناہ گھبرا گئی۔

"کہاں ہیں آپ ٹھیک۔ جھوٹ بولا مجھ سے۔"

"اب تم آ گئی ہو ناں۔ وعدہ۔ میں بالکل ٹھیک رہوں گا یہ چھوٹی موٹی تکلیفیں تو مجھے کافی عرصے سے لاحق ہیں۔ ان سے کیا ڈرنا۔" انہوں نے شفقت سے اسے دیکھا۔ اتنے میں سلیمان بھی وہیں چلا آیا۔

"آپ نے دوا کھالی ہے؟"

"ہاں کھالی ہے۔ علیزا نے کھلائی ہے بلکہ مجھے کچن سے پانی بھی لا کر دیا ہے۔ دیکھ لو میری بیٹی کتنی اچھی ہے۔" انہوں نے بڑے فخر سے اسے دیکھتے ہوئے سلیمان سے جتانے والے انداز میں کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"سلیمان! مجھے علیزا کی طرف سے تمہاری کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ علیزا کے خوشیوں کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔"

"ٹھیک ہے ابا جان۔" وہ سر جھکا کر سعادت مندی سے بولا۔

"جاؤ آرام کرو۔ تم دونوں کی نئی زندگی کی شروعات پہ میرے پاس دعائیں ہیں۔ ہمیشہ خوش اور سکھی رہو۔ میں بھی اب سوؤں گا۔" وہ دراز ہو چکے تھے۔ علیزا آہستہ آہستہ اٹھی۔ کلائیوں میں بجتی چوڑیوں اور چھن چھن کرتی پائل سے پرسکون رات کے سناٹے کو مجروح سا کر دیا۔ وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ پاؤں صوفے پہ رکھ کر اس نے دونوں پاؤں سے بھاری پازیب اتار دی۔

"کیا لاؤنج میں بیٹھ کر تمام رات یہ شغل جاری رکھنے کا ارادہ ہے۔" یہ مسلسل اضطراری و بیگانگی کے عمل میں بار بار ہاتھوں کی انگلیوں سے انگوٹھیاں اتار اور پہن رہی تھی۔ سلیمان کا اشارہ اسی جانب تھا۔ اس کی نگاہیں نیل پہ دھیرے علیزا کے پاؤں پہ مرکوز تھیں جو مہندی کے خوب صورت گل بوٹوں سے سجا ہوا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ جانے کیا بات تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ذرا بھی خوش نہیں ہے حالانکہ اصولی طور پہ اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔ سلیمان اس کی خوشی، اس کا خواب، اس کی آرزو تھا۔ اسے پا کر آج اسے نازاں ہونا چاہیے تھا مگر وہ بہت پژمردہ لگ رہی تھی۔

"اٹھو یہاں سے۔ میں لائیٹ بند کرنے لگا ہوں۔" اسے یونہی بیٹھے دیکھ کر وہ دوبارہ زور دے کر بولا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ لاؤنج سے سلیمان کے کمرے تک کا فاصلہ اسے بہت دشوار گزار اور پیچیدہ محسوس ہوا۔ وہ پہلے بھی اس کمرے میں آتی رہی تھی مگر آج اس کی حیثیت بدل چکی تھی اور اسی بدلی ہوئی حیثیت کا تعین اسے مشکل لگ رہا تھا۔ کسی حل نہ ہونے والے سوال کی طرح۔

سلیمان [illegible] پندرہ منٹ کے بعد آیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے مگ تھے۔

"تمہیں پتہ ہے، اس وقت مجھے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ صبح سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ سب ہلچل میں جو تھے۔ میں نے جلدی میں بنائی ہے۔ پتہ نہیں کیسی بنی ہے۔ تم بھی۔ تم بہت اچھی چائے بناتی ہو مگر اس وقت تمہیں زحمت دینے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آخر آج نئی نویلی دلہن ہو۔ کچھ دن تک تو تمہارے ناز اٹھانے ہی پڑیں گے۔" سلیمان نے چائے کا مگ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے خاموشی و آہستگی سے لے لیا۔

"بہت ٹھنڈ ہے آج۔ ہماری منگنی کے دن بھی ایسی ہی ٹھنڈک تھی اور [illegible] [illegible] ہے۔ ایسے موسم میں چائے بہت اچھی اور سکون بخش لگتی ہے۔" وہ اس کی خاموشی محسوس کر رہا تھا۔

علیزا نے چائے کا مگ وہیں پیئے بغیر رکھ دیا جبکہ سلیمان اپنی چائے پی کر ختم کر چکا تھا۔

''علیزا! کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔'' وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ اس کی بند پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں جن پہ ننھے منے تارے چمک رہے تھے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے ادھوری خوشیاں اور بجے ہوئے لوگ ہی کیوں ملتے ہیں۔ غیر تقسیم شدہ محبت' مکمل اور خالص محبت میری قسمت میں نہیں ہے کیا۔؟''

سلیمان من سا ہو گیا۔ اسے علیزا سے اس سوال کی امید نہیں تھی۔ وہ اضطراری انداز میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا جسے وہ وقفے وقفے سے کش لگا رہا تھا۔

''علیزا! تمہیں مری میں گزارے گئے وہ چند دن شاید یاد نہ ہوں مگر مجھے یاد ہیں۔ میں تمہارے سامنے ہمیشہ ایک حد میں رہتا تھا مگر اس رات کی خوابناکی پوری طرح مجھ پہ چھاتی جا رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔ تم میرے سامنے رہو۔ ایک دو بار میرا نفس تڑ کھڑایا مگر تم اپنے کمرے میں سونی اور منی کے پاس چلی گئیں۔ عین اسی وقت جب میں بہت تنہائی اور تمہاری کمی محسوس کر رہا تھا۔ رانیہ کا فون آ گیا۔''

اس کی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ علیزا کو رانیہ کا ذکر سن کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سلیمان ذہنی طور پہ اسے ٹارچر کرنا چاہتا ہو ورنہ اس وقت رانیہ کا قصہ کیا معنی رکھتا تھا۔

''رانیہ کے فون سے مجھے بہت خوشی ہوئی اس رات مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کافی دیر مجھ سے باتیں کیں۔ یہیں سے میں نے رانیہ کی ذات کے بارے میں گہرائی سے سوچنا شروع کیا۔ وہ ایک کمزور اور پست حوصلہ لڑکی تھی جو قدم قدم پہ دوسروں کے سہارے کی محتاج تھی۔ اسے لاڈ میں پالا گیا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات مجھ سے شیئر کرتی اور مشورہ چاہتی۔ وہ کلی طور پہ اپنے تمام معاملات میں مجھ پر انحصار اور اعتبار کرنے لگی۔ وہ کہتی کہ میری موجودگی میں اسے بڑا تحفظ ملتا ہے۔ اس اعتراف سے میری مردانہ انا کو بڑی تسکین ملی''۔

علیزا کا تمام چہرا آنسوؤں سے بھیگ چلا تھا۔ سلیمان کا اعتراف محبت اس کے وجود کو جیسے آگ میں جھونک رہا تھا اس کے من میں دھڑا دھڑ بھانبڑ جل رہے تھے۔

''میں خلوص دل سے اس کی مدد کر رہا تھا۔ روز روز کی ملاقاتیں اٹھنا ملنا۔ رانیہ کے ساتھ اکیلے آنا جانا۔ ان سب نے مجھے رانیہ کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جو یقیناً میرے

لیے ایک نیا رخ تھا۔ علیزا! ہوسکتا ہے میری سوچ آگے پرواز کرتی مگر تمہارے جھگڑے اور الزامات نے مجھے بھی خلفشار میں مبتلا کر دیا۔ میں تمہیں جلاتے۔"

"بس کریں۔ خدا کا واسطہ ہے چپ ہو جائیں۔ میں نہیں سن سکتی۔ چپ ہو جائیں۔" گھٹی گھٹی آواز میں وہ چیخ پڑی۔

"آپ مجھے ذہنی اذیت اور رانیہ کے حوالے سے شکست کا احساس دلا رہے ہیں تو پلیز چپ ہو جائیں۔ میں نہیں سن سکتی۔ مجھ میں اتنی اعلیٰ ظرفی اور ذہنی وسعت نہیں ہے جو آپ کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام بھی سن سکوں۔" اس کا نازک وجود جل رہا تھا۔

"پلیز علیزا! چند منٹ سکون سے میری بات سن لو ورنہ ساری زندگی بے سکون رہو گی۔ میں جب رانیہ کے ساتھ ہوتا تھا تو جب بھی تمہارا تصور میرے ہمراہ ہوتا۔ یہ تم ہی تو تھیں جس نے مجھے رانیہ کے ساتھ بہت دور تک سوچنے کے بارے میں تقریباً محدود اور باندھ کر رکھ دیا تھا۔ علیزا آئی سوئیر تم اس دوران ایک سیکنڈ بھی میرے ذہن سے اوجھل نہیں ہوتی تھیں۔ تم میری زندگی میں میری سوچوں پہ قابض ہونے والی پہلی لڑکی ہو۔ بہر حال رانیہ کے لیے میرے وہ جذبات نہیں تھے جو تمہارے بارے میں تھے اور ہیں۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ رانیہ کے بارے میں تصور کرتے ہوئے میں ہمیشہ ابہام کا شکار ہو جاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ میرا تمہارے ساتھ نکاح ہو چکا تھا اور وہ سبحان کے نکاح میں تھی۔ سبحان کے آخری الفاظ سے لگتا ہے جیسے وہ سچ مچ رانیہ سے محبت کرتا تھا مگر اس کی محبت کتنی سفاک اور اذیت ناک تھی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ علیزا! میرا اعتبار کرلو...... میں نے تمہاری طرح سے کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا۔"

محبت طاق دل پہ
جلنے والا
وہ چراغ آخر شب ہے
کہ اس کی لو
اگر مدھم بھی پڑ جائے
تو اندر کا اجالا
کم نہیں ہوتا
محبت کرنے والوں کو خبر ہے

کچھ دن یونہی بے خواب و بے خواہش

اسیری کاٹ سکتی ہے

ہمیشہ کے لیے لیکن

یہ محور سے نہیں اٹھتی

محبت

ایسا راستہ ہے

کہ جس پہ

واپسی ممکن نہیں ہوتی

"علیزا! میری کمٹمنٹ تمہارے ساتھ تھی محبت میں نے صرف تم سے کی ہے۔ آج تمام تر حقیقت تمہارے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ تمہاری مرضی ہے تم مانو نہ مانو۔ علیزا! اگر میں تمہیں ذہنی طور پر اذیت دینا چاہتا یا یہ میرا مطمع نظر ہوتا تو میں تمہیں ہرگز یہ سب نہ بتاتا۔ میں نئی زندگی کا آغاز وسوسوں اور شک سے آزاد ہو کر کرنا چاہتا ہوں تا کہ بدگمانی تمہارے دل میں جگہ ہرگز نہ بنا سکے۔ علیزا! تم عورتیں سچ مچ بڑی جذباتی ہوتی ہو۔ مرد پہ کسی دوسری عورت کا سایہ بھی پڑ جائے تو تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔"

سلیمان نے جوتے کی نوک سے سگریٹ کا ٹکڑا مسلا۔ وہ اس سے دور صوفے پہ بیٹھا ہوا تھا۔ علیزا نے گھٹنوں پہ رکھا سر اٹھایا رونے سے اس کی آنکھیں گلابی گلابی سی ہو رہی تھیں۔ اس کے سینے سے ایک آسودہ سانس برآمد ہوئی۔ مسکراہٹ کرن بن کر اس کے لبوں کی تراش میں چمکی۔

سلیمان نے اس کے چہرے پہ پھیلتی خوشی فوراً محسوس کر لی۔

"معاف کرنا علیزا! ابا جان کی اچانک بیماری کی وجہ سے میں تمہارے لیے کوئی گفٹ نہیں لے سکا ہوں ویسے رونمائی کے طور پر اگر تم مجھے قبول کر لو تو کیا کہنے یا پھر گملے میں لگا کوئی پھول توڑ کر لے آؤں۔"

علیزا نے بھاری دوپٹے سے آہستہ سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ سلیمان اس کے قریب تھا۔ آف وائیٹ و میرون کامبی نیشن کے بھاری جوڑے میں ملبوس زیورات و پھولوں سے آراستہ مہندی، پرفیوم اور ابٹن کی خوشبو میں بسی سراپا سنگھار کیے سامنے تھی۔

"شادی مبارک ہو بھئی۔" وہ مسکراہٹ لبوں میں دبا کر بولا۔

"بڑی جلدی آپ کو مبارک باد دینی یاد آئی ہے۔" علیزا کو ابھی تک اس بات کا غم تھا۔

"آپ نے مجھے رونمائی بھی نہیں دی۔ اتنے کنجوس ہیں آپ۔"

"صلح کر لو تو سب مل جائے گا۔"

"اچھا پھر ٹھیک ہے دوستی۔" علیزا مسکرائی۔

"یوں نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دو عدد مسلمان ایسے تو صلح نہیں کرتے جو تم سوکھے انداز میں کہہ رہی ہو۔ صلح کرنے کے اصول بھی پورے کرنا چاہئیں۔ وہ قوال بھی کچھ یہی کہہ رہی تھی نا۔"

سدا کا سنجیدہ سلیمان اس وقت بہت شوخ ہو رہا تھا۔ "آج ہماری صلح ہوئی ہے اسی خوشی میں......" سلیمان کی ادھوری بات کا مطلب وہ بخوبی جان چکی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے۔ میری رہی سہی خفگی بھی ختم ہو گئی۔ ابو جان کی بات پہ یقین آ گیا ہے۔ واقعی ابو کا انتخاب لاجواب ہے۔ مجھے تم جیسی نرم دل لڑکی ہی چاہیے جو میری آئندہ نسلوں کو بھی سنوار سکے۔ کبھی روٹھے، کبھی مان جائے اور جب خفا ہو تو چوری چوری مجھے کھڑکی سے دیکھے المیہ شاعری پڑھے۔ غمگین گانے سن کر روئے اور مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرے۔" سلیمان کا لہجہ شریر ہو گیا تو وہ جھینپ گئی۔

چاند اپنا سفر طے کر کے جانے کی تیاریوں میں تھا۔ آسمان پہ پو پھوٹ رہی تھی۔ ہر رات کے بعد ایک روشن سویرا ہوتا ہے۔ علیزا کی زندگی میں بھی یہ روشن سویرا طلوع ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا۔ سلیمان کی رفاقت میں اس کی آئندہ آنے والے تمام دن خوب صورت ہوں گے۔

❁......